

TIGHT BINDING BOOK

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222040

UNIVERSAL
LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No.

۱۹۱۴۳۷
ج-۳

Acc. No.

۶۱۵۵۹

ابوظاهر

۱۱.

OLP-354 29-4-72-10,000.

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. A915.44

Accession No. 21559

Author.

1009

Title

This book should be returned on or before the date last marked below

فکاش

ان مزاحیہ مضامین کا مجموعہ جو ملک کے مقتدر
رسالوں میں شایع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں،

۱۹۳۸ء

از

سید ابوطاہر

بی۔ ایس سی (لک) بی۔ ٹی (بکینی)
گورنمنٹ اردو ٹریننگ کالج - پولونا

ناشر

امپیریل بک ڈپو لکھنؤ

۱۹۳۸ء

بار اول

فہرست مضامین

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۱۶۵	روشن دماغ	۱	حضرت
۱۷۳	مول تول	۱۷	پیکاری
۱۸۵	دُکھی داسی	۳۳	ہل چل
۱۹۳	صدائے بازگشت	۴۷	داڑھی
۱۹۸	بمبئی کے مکان	۷۲	ندامت
۲۰۳	دیاسلایوں کا قحط	۸۱	شکلف
۲۱۰	کنگھیاں	۸۸	کالیستا
۲۱۷	تکلیف	۱۰۲	نوک جھونک
۲۲۵	مُرغے کی ٹانگ	۱۱۴	آغوشِ فطرت میں
۲۴۳	نانا جان	۱۲۲	پان کار
۲۴۹	کنوارے کامکان	۱۳۲	مغلطہ
...	...	۱۴۱	گھونگھٹ کی آڑ

سید علی رضوی ایم۔ اے نے عالمگیر
ایکسپریس لاہور میں باہتمام حافظ محمد عالم صاحب پٹر
چھپوا کر لکھنؤ سے شائع کیا۔

حضرت

لندن کی گوبڑک ٹریٹ ناکام اور کس میں پس ادیبوں کیلئے مشہور تھی۔ جن میں سب سے پہلے جہانگیر کی عظیم الشان شخصیت بھی شامل تھی۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہندوستان میں ان خصوصیات کی حامل ایسی کون سی سرگ ہو سکتی ہے جس میں جہانگیر ایسی بزرگ ہستیاں تعمر گمنامی کی تاریکیوں میں ادبِ اردو کے آسمان پر طلوع ہونے کے لئے محفوظ کر دی گئی ہیں اور وقتِ معینہ کا انتظار کر رہی ہیں۔ کون جانتا ہے کہ مستقبلِ قریب کے اس آفتابِ صحافت کے سامنے کتنے ٹٹلتے ہوئے چرلغ اور کتنے جھلملاتے ہوئے تارے خود کی روشنی کو قائم رکھ سکیں گے۔ تجربہ تو یہی بتاتا ہے کہ مرگ صد ہزار انجم ہی سے سحر کی پیدائش ہوتی ہے۔ بہر حال چونکہ ہنوز دنیٰ دورِ راست ہے اس لئے ہم اپنے قلم کی جولانی کو موجودہ صورتِ حالات ہی تک محدود رکھیں گے اور آپ کی طبعِ نازک پر آئندہ کہا ہوگا کہ خیالی پروگرام سے بار ڈالنے کی کوشش نہیں کریں گے۔

قدما کا ایک نظریہ تھا کہ بڑا شاعر مرثیہ گو ہو جاتا ہے مگر اس کو خدائے سخن حضرت انیس مرحوم کی طلاقتِ بیانی نے غلط ثابت کر دیا۔ اسی طرح موجودہ دور میں بعض نقاد ان کا خیال ہے کہ بکاگر بچوٹ مضمون نگار بن جاتے ہیں۔ ہم کو اس سے بھی اختلاف ہے۔

در اصل دنیا میں مشکل ترین پیشہ کاشتکاری کا قرار دیا گیا ہے جس میں غریب کسان کو سرمایہ قناعت بن کر اپنی ہستی اور اپنے خرمن کو عناصر قدرت کے رحم و کرم کے سپرد کر دینا پڑتا ہے لیکن ہم اپنی ذاتی رائے کی بنا پر کاشتکاری کو صرف مشکل پیشہ تسلیم کرینگے اور مضمون نگاری کو مشکل ترین۔ اس فضیلت کی وجہ یہی ہے کہ موخر الذکر کو عناصر ادب کی ستم بانیوں کا تختہ مشق بننا پڑتا ہے۔ جس کا نظام قدرت کے نظام کی طرح اٹل اور کسی خاص اصول کے ماتحت نہیں ہوتا۔ ہم اس حد تک کہنے کیلئے تیار ہیں کہ قناعت "جو کاشتکاری کا طرہ امتیاز خیال کی جاتی ہے مضمون نگاری کی قناعت کے مقابلہ میں عشرِ شیر بھی نہیں۔ علاوہ بریں اخلاق حسنہ کا مجسمہ اگر کوئی دیکھنا چاہے تو اسے اردو کے مضمون نگاروں اور ادیبوں میں تلاش کرنا چاہئے یہی سبب ہے کہ ہندوستانی یونیورسٹیوں کے اکثر اجارہ دار اس خاص شاہراہِ عمل پر گامزن ہیں تاکہ اس میدان میں اخلاق حمید کی تجلیاں قائم رہ سکیں۔

ہم نے مضمون نگاروں کیلئے اُوزبان کی قید اس لئے لگادی ہے کہ مقابلۂ انسان بن میں کوئی ایسی خصوصیت اور جاذبیت موجود نہیں جو ایسے بے نفس اور غیر ظالم کارکنوں کو اپنی طرف مائل کر سکے۔ دراصل موجودہ صورت حال کے ماتحت اس پرنسپل پاشی کرنا گو یا سحرائے افریقہ کی تپتی اور سلگتی ہوئی زمین پر کھل چلنا ہے۔ وہ لوگ قابلِ مبارکباد ہیں جو اس حقیقت سے باخبر ہونے کے باوجود اس سراب میں جا رہے ہیں۔ اگر سچے ہیں تو ان کی آخری منزل تک پہنچنا حاتم طائی کے دل گردہ کا کام ہے۔

جس نے حسن بانو کے سات سوالوں کا جواب دریافت کیا تھا۔ نو آموزوں کیلئے یہی۔ اسے کی ڈگری سے کسی طرح کم نہیں جو حاصل ہونے سے قبل کتابوں کی مخزن اور مل جانے کے بعد تناؤں کی مدفن ہوتی ہے۔

واقعی رسالوں کی بنجر زمین پر چکمانہ نکھٹوں کی تخم ریزی اور اجارہ داران ادب کی سردھری، نقادان ادب کی طوفان خیز اور تباہ کن نرالہ باری اور پبلک کے مذاق کی خشکی بحیثیت مجموعی اردو کے مضمون نگاروں کی جولانی طبع کے لئے ہولناک جراثیم بن گئی ہوتی ہیں اور اس کا شہر بھی وہی ہوتا ہے جو خشک سالی کے دوران میں تازہ تباہ نو بہ نوحہ کا۔

غنا صرا دہ کی متذکرہ بالاستم ظریفیوں کے علاوہ ایک غریب مضمون نگار کو اس تہ میں وقت، دماغ اور دکھانے کے ٹکٹوں کا ایسا مسلسل سرمایہ لگا پڑا ہے جو میرے خیال میں کسی متحدہ کمپنی کو نیلگری اور آسام کی بنجر چٹانوں پر چائے کی شہت کرنے یا بمبئی کی پبلک کو روٹی کے نمبروں میں بھی نہ لگانا پڑتا ہوگا۔ البتہ اس کے منافع میں پرچے اور سالنامے کثرت سے آتے ہیں جن کو دیکھ کر اکثر سینکڑ ہینڈ (استعمالی کتابیں) کی دوکان کھولنے کا شوق پیدا ہو جاتا ہے۔ ان میں ایڈیٹروں کی طرف سے عزت افزائی کے خطوط بھی ہوتے ہیں جو بعینہ وہی درجہ رکھتے ہیں جو ڈپٹی کمشنر بہادر کے سرٹیفیکٹ ایک اس زمیندار کے حق میں جس نے جنگ عظیم میں بہادر اور لڑاکو کسانوں کو فوج میں بھرتی ہونے کی ترغیب دی ہو یا کانگریس کے زمانے

میں مکمل کے نیلہ میں بولی بڑھانے والوں کی حوصلہ افزائی کی ہو۔

اسی ضمن میں ایک طویل امیدواری کے بعد ایک خطاب البتہ عطا ہوا ہے، جو "حضرت" کے نام پر مشتمل ہے اور جو ہمارے مضمون کا عنوان ہے۔ ہم اس لفظ کی تاریخ پر کسی قسم کا تبصرہ تو نہیں کر سکتے۔ ہاں اتنا ضرور جانتے ہیں کہ چند سال قبل تک یہ پیغمبرانِ عظام اور اولیائے کرام کی واحد ملکیت خیال کیا جاتا تھا۔ شاید اسی خیال کی بنا پر ہماری محترمہ نے ایک روز ایک رسالہ کی ورق گردانی کے بعد ضمناً ہم سے ارشاد فرمایا تھا کہ "اگر میں ایڈیٹر ہوتی تو حضرت کے ساتھ رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ کا اور اضافہ کرتی۔" جس کو سن کر ہم نے میسجٹ لکھا تھا کہ "خدا نہ کرے"۔ بہر حال ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان کا یہ ارادہ کہاں تک واجب التسلیم اور حق بجانب تھا۔ اسی سلسلہ میں اگر نسوانی رسالوں کی مضمون نگار محترمات کے نام کی کلغی کی طرف اشارہ کر دیا جائے جو حضرت کا ہم تپہ ہے اور "آنسو" پر مشتمل ہے تو بیجا نہ ہوگا۔ ہم باوجود عفریزی کے یہ تپہ لگانے میں ناکام رہے کہ آیا یہ ایڈیٹروں کی طرف سے اضافہ ہے یا خود مضمون نگاروں کی جدت، اگر ایسا ہے تو سوال کیا جاسکتا ہے کہ جن حقوق کی بنا پر؟

ہمارے رشتاتِ قلم کا اصل مقصد ان نوآموز ادیبوں کو فائدہ پہنچانے کا ہے جو اس میدان میں گامزن ہونے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ اسی ضمن میں ہم یہ بھی نوٹ کر دینا چاہتے ہیں کہ ہمارے مقالات فی الواقعہ پارلیمنٹ کے ارباب حل و عقد کی گویا ہر افشانیوں

کی طرح تذکرہ ہوتے ہیں واقعہ نہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہماری نوکِ قلم سے کاغذ میں جمید نہیں ہوتے۔

نفسِ مضمون کی طرف رجوع کرتے ہوئے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ غریب مضمون نگار دو عظیم چکی کے پاٹوں کے بیچ میں اپنی ادبی زندگی گزارتا ہے جن میں سے ایک پاٹ ایڈیٹر ہیں اور دوسرا پبلک۔

اکبر کے قول کے مطابق بیوی راضی رہیں اور کلکٹر صاحب اور ہمارے مشورے کی رو سے پبلک راضی رہے اور ایڈیٹر صاحب، اس لئے بہتر ہو گا کہ ”حضرت“ جو ایک ادیب کیلئے معراجِ ادب ہے، اس کے حصول کے لئے ہم سب سے اول ایڈیٹر کو کاغذ پر نفس کریں تاکہ ہم ان کی ہمدردی اسی طرح حاصل کر لیں جس طرح خان بہادری کے امیدوار حکام بالادست کی نگاہِ کرم کو اپنی طرف منغطف کرانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ یہ امر چنداں دشوار بھی نہیں ہے کیونکہ ایڈیٹر بھی اسی مادہ سے مرکب ہیں جو فرشتوں کے بنیادی مادے سے کسی حد تک مختلف ہے۔ یہاں یہ امر غلط خاطر رہے کہ میراٹے سخن ان مضمون نگاروں کی طرف نہیں ہے جو ”ایں سعاد بزورِ بازو نیست“ کے مصداق ہیں۔

مضمون نگار اور ایڈیٹر کا تعلق بعینہ وہی ہے جو ایک مزدور اور سرمایہ دار میں اسی لئے ذیل کے اصول میں نے اپنے ایک نئی چھاپ کے خان بہادری دوست کے مشورے سے قائم کیا ہے جو بحیثیت ”خود حضرت“ کے امیدواروں کے لئے ایک

مستقل دستور العمل کا کام دینگے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ ہمہ وجہ مکمل ہیں۔ ممکن ہے کہ ترمیم و تفسیح کی ضرورت پڑے جس کے لئے ہم ہر وقت تیار ہیں۔

سر دست ان کی تعداد صرف چھ ہے اس لئے ہر باقی فرما کر ترتیب کو مد نظر رکھتے ہوئے شمار کیجئے۔ اول قرابت، دوم درخواست، سوم تحریک چپام سفارش، پنجم رشوت اور شتم جسارت۔

اب ان عنوانات کی تشریح بھی ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) "قرابت"، دفتر کے بڑے باوجودی کی قرابت حصول ملازمت کی سہری کنجی ہے اسی اصول کے ماتحت ایڈیٹر کی ذات والا صفات سے توسل ایک مضمون نگار کیلئے بہترین فضیلت ہے اس سعادت جو ہستیاں محروم ہوں ان کو چاہئے کہ دفتر کے کتاب سے رجوع کریں جو بیک گردش قلم ان کو ادیبوں کا تاجدار بنا سکتا ہے یہ ہنگامی فضیلت رسالے کے دوسرے نمبروں میں رواں آتا اور رسماً ایک مستقل حیثیت اختیار کر لے گی جس کو ایڈیٹر کی نوک قلم بھی نہیں مٹا سکتی۔

(۲) "درخواست"۔ مخلصانہ خدمت کے ضمن میں ہر صبح کی ڈاک سے ایک مضمون کی بلاناغہ روانگی تریاق کا حکم رکھتی ہے۔ یہ نوٹ کر لیجئے کہ مضامین کسی دوسری زبان کا ترجمہ ہوں جن میں اہل مصنف کا نام لکھنا اور اس کے تحت میں مانوڈ تحریر کرنا ایک ادبی غلطی ہے۔

(۳) "تحریک" کسی رسالے کے چند ناظرین کے پراثر خطوط ایک مضمون نگار کی

قابلیت اور حق کو پایہ ثبوت تک پہنچا دیتے ہیں، ہاں البتہ ایسے خطوط کے ٹکٹ کی ذمہ داری خود امیدوار کے سر پر اخلاقاً عاید ہوتی ہے۔“

(۴) ”سفارش“ تحریک اور سفارش میں وہی فرق ہے جو ”تم“ اور ”تو“ میں ہے۔ اول الذکر میں زور ہے اور آخر الذکر میں بیچارگی، بہر حال اس مقصد کے لئے کسی حملہ نقاد کی خدمات آسانی سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

(۵) ”رشوت“ درخواست اور رشوت بھی دو جدا گانہ حیثیتیں رکھتی ہیں۔ پہلی ٹھکرانی جاسکتی ہے لیکن آخری شکریہ کے ساتھ قبول کرنا ہی پڑتی ہے۔ ان دونوں صورتوں کا نازک اور باریک فرق دراصل کچھری کے کارکنوں اور پولیس افسروں کی لین دین میں آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے کسی رسالہ کی اشاعت میں سستی دینا اور اس کا پروپیگنڈا کرنا دراصل ایک قسم کی رشوت ہی تو ہے۔ سول جینینی اس کی بہترین صورت ہے۔ (۶) ”جبارت“ چونکہ ”حضرت“ کا کاپی رائٹ محفوظ نہیں اس لئے ہر شخص کو اختیار ہے کہ وہ اس لفظ کو اپنے نام کا جزو لاینفک قرار دے دے اور ایڈیٹر کو مجبور کرے کہ رسالہ میں اس کی اصل کی نقل تحریر کرے۔ چنانچہ اگر کسی کو اعتراض ہو تو اس کے سامنے سرپرش تو تم داس ٹھاکر داس کا نام نامی پیش کیا جاسکتا ہے جو دراصل ہیں تو ذات واحد لیکن ڈبل شخصیتوں کے حامل ہیں اور چند ماہ قبل تک ہم ان صاحب کو صاحب خانہ کہتے تھے اسی ضمن میں حکیم، مولوی، حاجی، خادم کعبہ اور سید وغیرہ بھی آسکتے ہیں جن کے محل استعمال اور حق ملکیت پر کوئی اعتراض کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

حضرت کا خطاب ایک پرانی وضع کا انجن ہے جس کو چالور کھنے کیلئے مضمونوں کا ایندھن مسلسل پہنچنا چاہئے اس مقام پر پہنچ کر مضمون نگار ایک ٹاپ رائٹر بن جاتا ہے جس کی کھڑکھڑ سے عاجز آ کر سوختہ دل بیوی ہندوستان میں میکہ لساتی ہے اور انگلستان میں ہمسایہ اور وہ خود ڈی کونٹینی کی طرح افیون کی گولی سے شناسائی پیدا کر کے مکمل ادب بن جاتا ہے۔

ایک عرصہ کے بعد سالہ کے فرہاشی خطوط اس کے لئے وارنٹ بن جاتے ہیں اور اس کی شخصیت اس سید کی طرح جسے افغانی پٹھان تبر کا پارہ پارہ کر کے مزار بنانے کے کام میں لاتے ہیں ہر طرف سے لاؤ لاؤ کی صدا بلند ہوتی ہے اس وقت وہ ایک گاندھی صفت شوہر ہوتا ہے اور سالوں کی متحدہ فوج اس کی سسرال جس کے خزانہ میں اس کے دماغ کی جبین خالی ہو جاتی ہیں لیکن نہ تو بھٹ پورا ہوتا ہے اور نہ ہی من مزید کی صداؤں میں کمی۔ آخر کار ایک زمانہ ایسا آتا ہے کہ اس کی آنکھیں عینک کے شیشوں میں تحلیل ہو جاتی ہیں۔ اس کے پاؤں کی قوت سلب ہو کر ہاتھوں کی انگلیوں میں صمود کر آتی ہے اس کا دماغ قلم کی نوک میں سرایت کر جاتا ہے اور اس کا معدہ دوات کے پیٹ میں ججم لیتا ہے۔ راتوں کی بستر کا غذا اس کا کاف، مضامین اس کے خواب اور خواب اس کی زندگی، وہ انسان نہیں رہتا بلکہ یہ مادی جسم تبدیل فناء کی لطیف تر بنتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے سر پر لے دے کے ایک غل راجاتا ہے۔ کھوکھلا

جس پر اتنے ہی بال باقی رہتے ہیں جتنے انڈے کے سر پر، شاعروں کے معشوق کی طرح جس کے کمر ہوتی ہی نہیں۔ وہ اپنی جسامت سے بے نیاز ہو کر رسالوں کے ابوہ کثیر میں آخر کار اس طرح گھل مل جاتا ہے کہ خود بھی کسی رسالے کا حسین سرورق معلوم ہونے لگتا ہے مرنے کے بعد یہ خیالی پیکر آواگون کے سخت امتحانوں سے مستثنیٰ کر دیا جاتا ہے اور اگر دوبارہ بھیجا بھی جاتا ہے تو کتابوں کے کیڑوں کی شکل میں۔

یقیناً ایک مضمون نگار کا انجام عبرتناک ہے اس لئے اگر حضرت بننے کو بعد حرمۃ علیہ بنا منظور نہیں تو اپنی ذات میں ایسے کیمیاوی تغیرات پیدا کرنے چاہئیں کہ ذیل کے مرکبات میں سے کسی ایک شکل میں تبدیل ہو جائے۔ اکسیر بننے کیلئے رسالوں کی بھٹی سے تقریباً قطع تعلق کرنا پڑیگا اور خود کو بلیک کے خیال مذاق "میں پے درپے بھجاؤ دینا پڑینگے۔ فی الحال صرف چار مرکبات ہی تجویز کئے جاتے ہیں آئندہ حسب ضرورت دوسری تدابیر پر بھی غور کیا جائیگا۔ ملحوظ خاطر رہے کہ یہ مجرب المجرّب ہیں اور تیر بہدت،

(۱) ایڈیٹری (۲) پروفیسری (۳) رومانیت (۴) تصنیف و تالیف

چونکہ عنوانات بحیثیت خود اپنے مطلب کو آشکارا کر رہے ہیں اس لئے مزید تفصیل کی ضرورت نہیں،

۴

اب رہا بلیک کا مسئلہ اس کے متعلق ہم بلا خوف تردد کہہ سکتے ہیں کہ جہاں تک مذاق فن کا تعلق ہے بلیک اس سے قطعاً معرّض ہے، عوام اور مذاقِ صحیح دو تضادِ شائیں

جن کا کیجا کرنا کسی سیدھے خط کے دوسروں کو ملانے کی کوشش کرنا ہے۔ اس کے دلول پر حکومت کرنے کیلئے پروگینڈا کے طلسمی اور ہوائی قلعے کی ضرورت ہے، جس کی تعمیر دوسرے معنوں میں خود کو طلسم میں بند کر لینا ہے جہاں سوائے صاحبقران ادب کے دوسرے ساحروں کی دسترس سے ایک ادیب ہمیشہ کے لئے محفوظ و مامون ہو جاتا ہے۔

(ہوکار ری) پروگینڈا کی خشت پلج کے مصالحو سے مضبوط ہوتی ہے اور اُنچ، واقعی دماغی قلابازی کی ایک بہترین صورت ہے جو پبلک کے لئے ضیافت طبع کا کام دیتی ہے اور عامۃ الناس کی زندگی کی کٹھن گھڑیوں کو چنڈ لمحوں کے لئے دکھپ بنا دیتی ہے مگر کارآمد نہیں کیونکہ وہ پلج ہی نہیں جو عمل کے دائرہ میں محدود ہو جائے ایسے ہوکار کا دماغی توازن ایڑی میں آجاتا ہے اور اس کے تلوے پبلک کے سروں پر قائم ہو جاتے ہیں اگر وہ چاہے تو جوتے پہن کر بھی لوگوں کی آنکھوں میں دُرائے ڈال سکتے ہیں ڈارون کی پلج مسئلہ ارتقا تھی جس کا طلسم اب ٹوٹ چکا ہے۔ سر آلو رلاج اور سر آر تھمر کانن ڈائیل کی پلج روحانیات ہے جارج برنارڈشا کی پلج دماغی سنک اور یہی ان لوگوں کی ہستی کو مافوق الفطرت شخصیت بنانے کی ذمہ دار ہے۔

ہندوستان کی سرزمین پر جسمانی نٹ بہت پیدا ہوتے ہیں لیکن دماغی نٹ کم، البتہ سرابندر ناتھ ٹاگور اور گاندھی جی نے اس زمانہ میں اس قسم کے سرکس کی بنیاد رکھی ہے جس کو پانیہ نکمیل تک پہنچانا ہمارا فرض ہے۔ اگر ہم اس مسئلہ پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ہماری پرواز خیال کے لئے بہت بڑا میدان موجود ہے جس کے

مقابلہ میں یورپ کا میدان تنگ ہو چکا ہے۔ ہمارے یہاں پنجاب کی سرزمین صحت سے پیغمبری کی پیداوار کیلئے زرخیز واقع ہوئی ہے اور نگال کی دہشت انگیزی کیلئے اس کے علاوہ کج کی دوسری صورتیں بھی ہیں مگر غور و فکر شرط ہے مثلاً کسی ہندوستانی اولوالعزم نوجوان کا ایورسٹ کی چوٹی پر چڑھنے کا صرف نوٹس دینا اور چند ماہ بعد قطب مینار کے عرشہ پر بیٹھ کر سائنس کا ایک رومان تصنیف کر دینا۔ یا خود کو بہادر مرحوم کا دوسرا چولا ثابت کرنا اور دہلی کے تخت و تاج کے لئے پارلیمنٹ میں دعویٰ کرنا۔ تصویریں اخباروں کو دینا، ملاقاتیں رپورٹروں سے کرنا اور روداد نقد لکھ کر روپیہ اور شہرت پبلک سے لینا مشکل مرحلے نہیں

پانچ کی بعض صورتیں فرسودہ ہو چکی ہیں۔ دنیا کا پیدل سفر اب بائیں ہاتھ کھل نہیں کیونکہ ہر مذہب ملک میں گداگری کے خلاف قانون بننے والے ہیں۔ رہ گیا سینما کی ایکننگ کا خیال تو سردست وہ بھی محال ہے کیونکہ موجودہ زمانے کے ہندوستانی ڈائرکٹر عمر پٹہ لکھا کر آئے ہیں۔



اسی سلسلے میں ایک حکایت بھی سن لیجئے۔ ہمارے ایک دوست حضرت بن جانے کے بعد صاحب تصنیف بھی بن گئے جو عین فطرت ہے۔ شادی ہو جانے کے بعد اکثر صاحب اولاد ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی عین فطرت ہے مگر دونوں میں لیاقت درکار ہے۔ کتاب شائع ہو جانے کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا خود کو شہر کیا

جلے یا کتاب کو۔ یہی مرحلہ ہمارے دوست کو بھی پیش ہوا اور انھوں نے میری رائے دریافت کی۔ میں نے ان کو مشورہ دیا کہ کسی رسالہ یا اخبار میں ضرورت ہے کے عنوان سے اپنی شادی کا اشتہار دیجئے جس میں اپنی لیاقت، قابلیت، شرافت اور دولت کا مبالغہ آمیز تذکرہ ہو اور لڑکیوں کیلئے عمر، حسن، دولت، شرافت، تہذیب، تعلیم، مذہب اور قومیت میں سے کسی چیز کی قید نہ لگائی جائے البتہ یہ شرط ضروری ہو کہ ہر امیدوار کو کتاب مذکورہ کی ایک کاپی نقد دم سے خرید کر اپنے حالات و ضروری اطلاعات اس کے سرورق پر لکھ کر بھیجنا چاہئیں ورنہ درخواست پر کسی قسم کی توجہ نہ کی جائیگی۔ چونکہ ہندوستان جنت نشان میں لڑکیوں کی کافی تعداد مدافضل میں ہے اس لئے مجھ کو یقین واثق تھا کہ ان کی کتاب کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جاتا۔ مگر بد قسمتی سے ان کی شادی ہو چکی تھی اس لئے وہ اس تجویز پر عمل نہ کر سکے۔

مجبوراً انھوں نے حسب دستور اپنے پہلے شاہکار کو ایک ایڈیٹر کے معائنہ کے لئے روانہ کر دیا اور بس۔ ایڈیٹر کا فرض منصبی تنقید کرنا ہے اور اس نے میرے خیال کے مطابق تنقید کی۔ دراصل کتاب اس کی مستحق ہی تھی۔ ادبی غلطیاں، پلاٹ کی خامیاں، صحت و نحو کی گستاخیاں اور خیالات کی ہرزہ سرائیاں ریویو کے صفحہ پر اس کثرت سے پیا کی گئی تھیں کہ کتاب اور مصنف دونوں کا شیرازہ منتشر ہو گیا اور دونوں ہمیشہ کے لئے قعر گنہامی میں ڈھکیل دیئے گئے۔

چند روز بعد وہ میرے پاس اس طرح تشریف لائے جس طرح میٹرک کا

ناکام طالب علم، میں نے ازراہ ہمدردی ان کو تلقین صبر کی اور ان کو یقین دلایا کہ اس دنیائے فانی میں اگر آپ کے صحیفے کی قدر نہیں کی گئی تو کوئی غم نہیں! اللہ دوسری دنیا میں آپ کی کتاب بیحد مقبول ہوگی اور ہر حور و غلمان کے ہاتھ میں اس کی ایک ایک کاپی ضرور بالضرور ہوگی۔ لاریب یہی طریقہ ہے نیک مصنفین کو اجر و ثواب عطا کرنے کا۔

مجھ کو افسوس ہے کہ انھوں نے مجھے ”عاقبت کی خبر خدا جانے“ کہہ کر خاموش کر دیا اور اس کے بعد مجبور کرنے لگے کہ میں ان کو ایڈیٹر نہ کروں کہ خلاف قانونی چارہ جوئی کرنے میں مدد دوں کیونکہ میرے کرم فرماؤں میں کئی سربراہ اور دبیر سٹراور وکیل بھی ہیں۔ مجھ کو ان کی اس ناعاقبت اندیشی پر رحم بھی آیا اور غصہ بھی لیکن میں نے ایک کو ظاہر کر دیا اور دوسرے کو پی گیا۔

آخر میں نے پھر آج کی لی، دوسرے روز انھوں نے میرے حسب مشورہ اپنے والد محرم کی طرف سے ایڈیٹر نہ کرنے کے نام ایک خط تحریر کیا جس میں خود کی ناگہانی موت کی اندوہناک خبر مندرج تھی۔ وجہ موت یہ ظاہر کی گئی تھی کہ مرحوم نے ادبی خدمت پر تندرستی کو قربان کر دیا تھا۔ کتاب پر غلط اور خلاف امید تنقید سمند ناز پہ اک اور تازیانہ ہوئی۔ مرتے وقت ایڈیٹروں کا کلمہ در زبان تھا اور کتاب زیر بحث سیدہ پر تھی۔ آخر میں مرحوم کی حسب وصیت کتاب کا حق تصنیف و تالیف محترم ایڈیٹر کے نام بخش دیا گیا تھا۔

نامکن تھا کہ ایک ادیب کی حسرتناک موت پر ایڈیٹر کا دل نہ ہسیتا۔ رسالے کے دوسرے نمبر میں ہی تحریر تھا جس کی میں پیشینگوئی کر چکا تھا۔ سیاہ حاشیوں کے درمیان ”اردو ادب کا سوگ“ ایک عنوان تھا جس کے پیچھے ادیب لیب حضرت..... مصنف..... کی مرگ ناگمانی پر اظہار گریہ و بکا کیا گیا تھا۔ رسالوں پر آپ کے رشتات قلم کے احسانات کا اعتراف کیا گیا تھا۔ اس سانحہ عظیم سے ادب اردو کی حسرتوں کا خون ہوا تھا اور جو ناقابل تلافی نقصان پہنچا تھا اس کا نالہ و ماتم کیا گیا تھا آخر میں ان کی یادگار منلے کیلئے رسالے کا ایک خاص نمبر نکالنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ ریویو کے صفحہ پر خاص طور سے ان کی بیک وقت بیوہ اور یتیم کتاب پر دست شفقت پھیرتے ہوئے گذشتہ نمبر کی تمام تنقید کا اس رخ بصوتی سے ابطال کیا تھا کہ میں ایڈیٹر کی نصف مزاجی اور دیانت داری کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ یہی نہیں بلکہ اس ”استفراغ ادب“ کو ”روح ادب“ کے نام سے تعبیر کیا تھا اور رسالے کے محترم ناظرین سے پرزور اپیل کی گئی تھی کہ اگر قسمت ادب کی خاطر نہ سہی تو مرحوم کی روح کو ایصال ثواب ہی کی غرض سے ایک ایک جلد ضرور خریدنا چاہئے۔

میں نے ریویو کے اس لاثانی نمونے کو پڑھ کر اپنے دوست کو زندہ جاویدستی بن جانے پر مبارکباد دی۔ اس تحریک کا یہاں تک نتیجہ ہوا کہ میں خود بھی ایڈیٹر کی قلم کی روانی کے ساتھ بہہ گیا۔ اور آئندہ سے ان کو ادیب ماننے لگا۔ اور ان کی کتاب کو ادب۔ چنانچہ جب دوبارہ میں نے اسی کتاب کو لیکر پڑھا تو مجھ پر واقعی وجد کا عالم

طاری ہو گیا گویا وہ کتاب طلسم ہوشربا بن گئی تھی۔ یہ جادو اور طلسم نہ تھا تو اور کیا تھا۔
 موت کا میاں بی کی ایک سنہری گنجی ہے۔ جس طرح بادل کے آنچلوں سے ڈھکی ہوئی
 پہاڑی اپنی اصل جسامت اور بلندی سے کہیں زیادہ بڑی معلوم ہوتی ہے اور دور کے
 ڈھول سمانے ہوتے ہیں اسی طرح موت کی نقاب کے اندر انسان بھی خدا معلوم ہونے
 لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نیک سپیر اور غالب شراب کمنہ کی طرح جلوؤں کی پاشانی میں
 زمانہ کی روانی کے ساتھ ساتھ اضافہ کرتے جا رہے ہیں۔ اسی مہول کی بنا پر ہمارے
 دوست نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ ہمیشہ مرحوم ہی رہینگے۔ اُن کے مضامین اس حالت
 میں بھی شائع ہوتے ہیں اور کتابیں بھی چھپا کرتی ہیں لیکن اس پر دے میں گویا یہ مرحوم
 کے پرانے مسودے ہیں جو باقیات الصالحات کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ سنا
 ہے کہ ان کے چند و ثنا ران کی تصانیف اور تالیفات کو یکجا شائع کرنے کیلئے
 ایک لمیٹڈ کمپنی کے قیام پر غور کر رہے ہیں۔

اسی ضمن میں ان کی اس مفروضہ موت سے جو نقصانات ہوئے ان کی تفصیل
 بھی خالی از دیکھی نہیں۔ ذیل میں ان کی تفصیل فہرست دی جاتی ہے۔

- (۱) ان کے اعزہ، اقارب اور دوستوں کا ایک انبوہ کشمیر ہندوستان کے
 مختلف مقامات سے تعزیت کی غرض سے ان کے بڑے بھائی صاحب کے مکان
 پر مجتمع ہوا۔ ان کے اخراجات کا بل اتنا ہی ہے جتنا خود کی تقریب شادی کا خرچ،
 (۲) ان کے کلچر کی یونین میں تعزیتی جلسے کی بنا کر گئی جس میں اولڈ بوائز

کی طرف سے تعزیتی ریزولوشن پاس کیا گیا۔

(۳) ان کے دفتر کی اسامی کے لئے لاتعداد عرضیاں آئیں، سفارشیں لائی گئیں اور ملاقاتیں لی گئیں۔ یہ مغالطہ اس حد تک بڑھا کہ محکمہ کی طرف سے انچارج افسر کے نام خالی جگہ کی اطلاع دینے میں تساہل کرنے پر اظہارِ ناراضگی کیا گیا تھا۔

(۴) پولیس کو ان کی موت کی خبر سن کر ان کے اعزہ پر زہر خورانی کا شک ہو گیا تھا۔
(۵) ان کے ورثہ کے نام پولیس افسر کی طرف سے بذوق کے لائسنس کو واپس کرنے کا حکم صادر ہو گیا تھا۔

(۶) میونسپلٹی کے دفتر نے ان کے اعزہ پر مقدمہ چلانے کی دھمکی دی تھی کیونکہ غنی رجسٹر کی خانہ پُری نہیں کی جاسکتی تھی۔

(۷) جج صاحب نے ان کی موت کی اخباری خبر کے یقین پر ان کا ایک دعویٰ خارج کر دیا تھا۔

(۸) انجمن نکاح بیوگان کے سیکریٹری صاحب نے علی مثال قائم کرنے کے لئے اپنا ذاتی پیام ان کی سوگوار بیوہ کے نام ارسال کیا تھا۔

آئیے ہم آپ بھی فاتحہ میں شریک ہو جائیں۔ ۶
حقِ معصرت کرے عجب آزاد مروت تھا،

بیگاری!

”دفتر میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ کیا اپنے باہر لٹکا ہوا بورڈ نہیں دیکھا۔“ یہ صاحبِ جواب سُن کر میرے پیر پتھر پھرنے لگے۔ مجھ کو خوب معلوم تھا کہ ایک پُرانا کلرک کل ہی مرا ہے اور اس کی جگہ خالی ہوئی ہے اس لئے میں اپنی قسمت آزمائی کرنے یہاں آیا تھا قاعدہ ہے کہ مُردے کی پوسٹنگ کر یا تو عسالتے ہیں یا تلقین پڑھانے والے مولوی یا کفن لگسوٹ خیراتی! اس مرحوم کے لڑکے اگر وہ دولتمند تھا، مگر متوفی کلرک سے ہیں ان مندرجہ بالا قسموں میں سے ایک بھی مناسبت نہ تھی۔ ہم تو صرف اپنے اس حق کو لینے آئے تھے جو بڈھا کلرک اپنی درازی عمر کی وجہ سے غصب کیے بیٹھا تھا۔

ہم متواتر چار سال سے بی۔ اے کی دیوار پر اچک اچک کر نشانہ لگاتے تھے، مگر ہر مرتبہ داخلی ہی جاتا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ ہم نوکری کی سبزی کو شیشہ میں اتارنے کی کوشش بھی کئے جاتے تھے اور سب طرح صبح اٹھ کر تھیل قدمی کرنے جایا کرتے تھے اسی طرح روزانہ کا مشغلہ یہ بھی تھا کہ کسی نہ کسی دفتر میں بھی پہنچ جاتے تھے اور باوجود بیچر اسی صاحب جو کوئی بھی ملتے تھے تو اُن سے ”جگہ خالی ہے“ کا سوال کر بیٹھتے تھے اور اسی بہانہ اندر قدم رکھ کر ان تمام بابوؤں کا ہاتھ بھی لے لیا کرتے تھے جو کُڑی

پریٹھے۔ ڈیسکوں پر گردن جھکائے دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے اپنے جبروں میں مستغرق نظر آتے تھے۔ کبھی کبھی وہ ہماری طرف نظر کرتے تھے مگر حقارت سے جس پر ہم شرمناکراہی آنکھیں نیچی کر لیتے تھے۔ شاید ان کو بلا عرضی دیئے ہوئے اور فزوں کے چکر لگائے بغیر یہ اسامیاں مل گئی تھیں۔

بجب چار سال سے متواتر یہی مشغلہ ہو تو ہم کیوں نہ شہر کے دفزوں کی دائر کڑی اور خستہ بن جائیں۔ شہر کے تمام بالوؤں کی قسموں اور رتوں کے ہم اتنے ہی بڑے عالم بن گئے تھے جتنے بڑے ہماری یونیورسٹی کے ایکسپروفیسر دستوں اور جانوروں کے عالم تھے۔ ہم نے دیکھا کہ یا تو تمام بالو جوان ہیں یا ادھیڑا اگر کچھ بوڑھے ہیں بھی تو وہ اپنے قویٰ کے لحاظ سے ہم نوجوانوں سے بھی زیادہ جینے کی قابلیت رکھتے ہیں اس لئے اب ہمارے سلسلے ایک ہی راہ گئی۔ تخفیف کی وجہ سے دفزوں میں کسی نئی جگہ کو کھلانا ناممکن تھا۔ ہندوستان کی اقتصادی حالات کا سدھارنا بھی ایک امر محووم تھا اس لئے ہم کو تلاش تھی ایسے بالوؤں کی جو اس دنیا سے بچی رست لینے والے ہوں۔ خوش بختی سے ایک دفز میں کوڑے کی ایک میز پر بیٹھا ہوا ایک بالو ہم کو نظر آیا جس کے متعلق یہ پیشین گوئی کی جا سکتی تھی کہ یہ دفتر میں چلا جائے گا والا ہے۔ دج یہ تھی کہ وہ بوڑھا بھی تھا اور سوکھا بھی اور کانت اس طرح تھا جیسے کوئی دنے کا بیلار۔

واقعی زندگی اور نوکری اس پر برا ظلم تھا۔

آپ ضرور یہ خیال کرینگے کہ ہم اس بابو کی موت کے متمنی تھے۔ مگر جناب یہ خیال
 تو کیجئے کہ بچنے ہی میں ہماری شادی کر دی گئی تھی اور جب تکابی۔ اے بین بچیں
 ہم تہائی درجن بچوں کے باپ ہو گئے تھے۔ اس پر مصیبت یہ تھی کہ جس وقت ہم
 اپنے فرسٹ ایڈیشن صاحبزادے کے رجسٹرڈ پبلشر بنے ہیں اسی وقت ہمارے والد
 اس دار فانی کے دفتر سے عالم جاودانی کے دفتر میں منتقل کر دیئے گئے۔ قدرت نے
 شاید ان کو دزدان میں خیال کیا ہو۔ وہ تو کہئے ہماری بیگم صاحبہ جو درجہ کی حاسدہ
 تھیں ہم کو اپنا زیور بیچ بیچ کر بڑھاری تھیں اور یہ انہیں کی کوششوں کا طفیل
 تھا کہ ہم بڑھکتے پھیل ہوتے۔ سُستاتے۔ دم لیتے اور گدے کھاتے کسی نہ کسی
 طرح بی۔ اے فیل کملائے جانے کے مستحق ہو گئے تھے ورنہ میٹرک بھی نہ ہو سکتے
 ان کا مقصد دراصل ہم کو فائدہ پہونچانے کا نہ تھا بلکہ ہمارے محلہ میں ایک صاحبزادہ
 تھے جو خود تو بی۔ اے تھے مگر برائے نام۔ دراصل انہوں نے اس ڈگری کے امتیاز
 اپنی اہلیہ کے نام منتقل کر دیئے تھے جو نسوانی رسالوں میں اپنا نام مسٹر محمود بی۔ اے
 لکھا کرتی تھیں۔ تبضہ مخالفانہ اسی کو کہتے ہیں۔ بس یہی خیال ہماری بیگم صاحبہ کو بھی
 بچپن کے رہتا تھا کہ کب ہم بی۔ اے پاس ہوں اور کب وہ ان الفاظ کو چھپٹ
 کر اپنے نام کے آگے لگائیں اور اپنے ہمسایہ سے سراٹھا کر بات کر سکیں۔ انہوں نے
 اسی انتظار میں مصنون نگاری بھی شروع نہیں کی تھی ورنہ وہ کب کی کہنہ مشوق،
 ہونگی ہوتیں اور نیز نگ خیال کے نگارش لطیف نمبر کے خاص کالموں میں جبکہ

پاچھی ہوتیں۔ اب جبکہ چار سال کی بہیم کوششوں سے ہم بی۔ اے پاس نہ کر سکے اور اس طرح اپنی بیگم کے دوپٹے کے لئے بی۔ اے کی بیل فراہم نہ کر سکے تو وہ ناراض ہو کر اپنے میکے چلی گئیں۔ پھر بتائیے اگر ہم نوکری کے لئے زیادہ ٹانگ و دو نہ کرتے تو کیا کرتے۔

ہاں! تو اب ہم نے اپنی کوششوں کو صرف ایک فتر کیلئے وقف کر دیا تھا اور وہ دفتر ہی تھا جس میں وہ تباہ کلک اپنی زندگی کے باقی دن کھانس کھانس کر گزار رہا تھا۔ "الانتظارا شدن الموت" ایسے ہی موقعوں پر کہا گیا ہے۔ ہر روز صبح کو دفتر کے قریب جانا۔ کھڑکی میں سے جھانکنا اور بڈھے کلرک کو حسب دستور اسی جگہ بیٹھیہ ہوئے پانا ہمارے لئے سخت امتحان تھا۔ مگر امید پر دنیا قائم ہے۔ مہینوں کی لگاتار کوشش کے بعد ایک روز ہم نے دیکھا کہ وہ کرسی خالی ہے۔ والدہ ہم نے خیال کیا کہ کہیں ہماری آنکھیں غلطی تو نہیں کر رہی ہیں مگر وہ تو حقیقت تھی۔ ہم جلدی سے دفتر کے برآمدے میں پہنچے اور ایک نوجوان بابو سے جو تھکن اتانے کے لئے باہر کھڑے سگریٹ کے دم لگا رہے تھے اس کے متعلق استفسار کیا۔ انہوں نے کہا کہ ان کو سانس کا دورہ پڑا ہے اس لئے وہ گھر رہیں۔

”کے روز کی چھٹی لی ہے؟“

”تین روز کی۔“

”صرف تین روز کی؟“ ہم نے حیرت سے پوچھا کیونکہ اس لحاظ سے تو مرض کی کچھ

اہمیت نہیں معلوم ہوتی۔ کم از کم پندرہ روز کی تو حُضرت لینا چاہیے تھی۔
 ”وہ کہاں رہتے ہیں؟ ہم نے لاپرواہی ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔

”کیا کوئی کام ہے؟“

”نہیں“ میرے سُننے سے گھبراہٹ میں نکل گیا۔ ”ہاں ذرا عبادت کو جانا“ میں نے
 بعد کو لوجہ بدلتے ہوئے کہا۔

”آپ جانتے ہیں اُن کو“

”کیوں نہیں!“ ہم کو مجبوراً کہنا پڑا اور اس طرح کہنا پڑا کہ گویا ہم اس کے ان
 بیجا سوالات پر تناؤ پینچ کھا رہے ہیں۔

”معاف کیجئے۔“ اُس نے نرم ہوتے ہوئے کہا۔ ”میں نے اس لئے پوچھا کہ آپ کو میں نے
 اس سے قبل کئی دفعہ ادھر سے گذرتے دیکھا مگر صاف سلامت ہوتے نہیں دیکھی تھی۔

”کوئی ضرورت نہیں تھی جناب۔“ ہم نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

”بہتر ہے۔ ہاں تو آپ کو ان کے مکان کا پتہ بتا دوں۔“

”اگر آپ مناسب سمجھیں۔“

”میرا تو کوئی حرج نہیں ہے مگر ہاں آپ کو بڑی دقت سے پتہ چلیگا خوب یاد دیا

مجھے بھی ایک گھنٹہ کے بعد وہیں جانا تھا۔ میں ابھی چلا چلوں گا آپ ہی کے ساتھ۔“

”مگر آپ میری وجہ سے کیوں حرج کرتے ہیں؟“

”حرج کا ہی کا حُضرت! یہ تو میرا فرض ہے کہ آپ کی رہبری کروں۔“

”آپ ان کے کوئی عزیز ہیں۔“

”میں ان کا داماد ہوں۔“

”ارے ارے۔“ ہم نے اپنے دل میں کہا۔ ”یہ تو برا ہوا۔“ ہم سوچنے لگے۔

”کیسے جناب اندر آجلیئے۔ بس چند منٹ آپ کو انتظار کرنا پڑیگا۔“ اس نے اس آواز میں کہا کہ ہم نے گھبرا کر اپنے قدم سیڑھیوں پر رکھ دیئے اور اندر کمرے میں جا کر کرسی پر بیٹھ ہی تو گئے۔

”میں ابھی حاضر ہوا۔“ کہہ کر وہ چک اٹھا کر دوسرے طبقہ کمرے میں چلے گئے۔

یہاں عبادت کس کو منظور تھی۔ اس بڑھے کلرک سے جان پہچان بھی نہ تھی مکان کا پتہ پوچھ کر ہم آفت میں پڑ گئے۔ اب ہم یہ سوچ رہے تھے کہ ان حضرت سے اپنا بیجا کس طرح چھڑائیں ابھی کسی رائے پر پہنچنے بھی نہ پائے تھے کہ ہمارے نئے دوست ملک الموت کی طرح دوسرے کمرے میں سے چھڑی ہاتھ میں لئے ہوئے نکلے اور ہمارے سر پر ہونچکر منہس دیئے اور تشریف لائے جناب۔“ کہہ کر ہماری رہنمائی کرنے کو آگے بڑھ گئے۔

مجبوراً ہم بھی اُن کے پیچھے پیچھے چلنے لگے مگر اس وقت دماغ کچھ ایسا کنڈنھا کہ کوئی ترکیب بھی ذہن میں نہ آئی۔ آخر اس خیال سے کہ کہیں ان کا مکان جلد نہ آجائے اور اس حالت میں ہم کو مجبوراً عبادت کے لئے جا کر مذمت نہ اٹھانا پڑے ہم نے اسی وقت فیصلہ کرنے کا ارادہ کیا۔

”آپ کا کیا اسم مبارک ہے جناب! انھوں نے ہم سے سوال کیا۔ جس کا جواب ہم نے اپنی محویت کے عالم میں دینا مناسب سمجھا اور ایک برطانوی مدبر کی طرح اس مشکل کو حل ہی کر لیا۔ ہم نے اپنے چاروں طرف نگاہ اٹھا کر آئندہ روز کا جائزہ لینا شروع کیا۔ ہم نے دیکھا کہ ہمارے سامنے سے ایک صاحب اس تیزی سے چلے آ رہے تھے کہ ان پر یہی اطلاق کیا جاسکتا تھا کہ شاید کسی حادثہ کی بنا پر ڈاکٹر کو بلانے جارہے ہیں اور یا کسی جگہ دعوت میں تشریف لئے جارہے ہیں۔ تسک ہے خدا کا کہ ہم ان کے ہارس پاؤں کا پہلے سے حساب لگا کر ان کے راستے کی پٹری سے علیحدہ ہٹ آئے تھے ورنہ ممکن تھا کہ اتصال باہمی سے ہمارے ماتھے اور ناک میں کسی کو ضرر و ضرب شدید کا حامل ہونا پڑتا۔ جب وہ ہمارے قریب سے پنجاب میل کی طرح سے نکل گئے تو میں نے فوراً ہی اپنے دوست سے مڑ کر کہا۔

”افوہ! دیکھئے پہچانتے بھی نہیں۔“

”کیوں کون ہیں؟“ انھوں نے گھبرا کر پوچھا۔

”مارے صاحب، ان کی تلاش میں میں چھ ماہ سے گھوم رہا تھا۔ میری سونے کی گھڑی نہ معلوم کہاں لیکر غائب ہو گئے تھے۔“

میں نے آوازیں ارتعاش پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ”معاف کرنا بھائی! میں بھر حاضر ہو گا۔ یہ موقع غنیمت ہے ورنہ پھر ہاتھ نہ آئینگے۔“ جلدی جلدی کہہ کر اور ان کے جواب کا انتظار کئے بغیر میں پلٹ پڑا اور اپنے فرضی چور کے پیچھے

”جی حضرت! - جناب، جناب! - کہتا ہوا لپکا۔ میرے دوست بھی اس پر پلاٹ سے محنت محفوظ ہونے کیلئے میری امید کے خلاف میرے پیچھے آنے لگے اسی دوران میں میری صداؤں کا اتنا اثر ہوا کہ وہ با دپا شخص ٹھسکا اور مڑ کر میری طرف دیکھنے لگا اور جب میں نے ”ڈرائسنے“ کے ساتھ ہاتھ کا اشارہ بھی شامل کیا تو وہ رک گیا۔ میں آنا فٹا اس شخص کے پاس پہنچا اور ”بھائی بھائی“ اس انداز سے کہا کہ وہ پریشان ہو کر میرا چہرہ دیکھنے لگا۔

”اس کے پاس بسبب ہے۔“ میں نے اپنے دوست کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو تنفاطیس کی سوئی کی طرح اس صورت سے کھینچے آرہے تھے کہ اس شخص کو پختہ یقین ہو گیا اور وہ میرے منظر اسیے متاثر ہو کر گھوڑ دوڑ کے گھوڑے کی طرح سر پٹ بھاگنے لگا۔ اس کے پیچھے میں اس انداز سے دوڑنے لگا کہ گویا تعاقب کر رہا ہوں۔ ہم دونوں تقریباً دو فرلانگ دوڑنے کے بعد سڑک کے ایک سرے پہ پہنچے جہاں سے میں نے اپنے قدم سست کر کے ایک پان والے کی دوکان کی طرف رخ کر دیا اور وہ شخص متواتر دوڑے گیا۔ یہاں تک کہ دو تین ہی منٹ میں میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اتفاقاً اسی دوکان پر اسی دفتر کا چیر اسی بھی بیڑی کا بنڈل خرید رہا تھا۔ میں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور اس کی تواضع سگریٹ سے کرنے کے بعد باتوں ہی باتوں میں اس بڑھے کلرک کا نام پتہ اور بیماری کا حال پوری طرح سے معلوم کر لیا البتہ

جس ڈاکٹر کا وہ علاج کر رہے تھے اس کا پتہ اور نام نہ معلوم ہو سکا۔ ورنہ میں نے ارادہ کیا تھا کہ اس سے جا کر ان کے مرض کے متعلق دریافت کروں گا کہ آیا سخت ہے یا یونہی سا ہے۔

شام کے وقت جب چاروں طرف اندیرا چھا گیا تو میں ان کے مکان کو تلاش کر کے اس کے پاس جا کر اس طرح منڈلانے لگا کہ آئندہ روز وہیں سے کوئی میرے اوپر شک نہ کرے۔ اس کجخت داماد کی طرف سے البتہ بہت بڑا خطرہ تھا۔ مگر کوئی اہم بات نہ معلوم ہو سکی۔ اس روز سے میرے ذمہ ڈبل ڈیوٹی ہو گئی۔ صبح کو دفتر کی دیوار کے اوپر سے جھانکنا اور شام کو ان کے مکان کے گرد طواف کرنا پڑتا تو یہ تھی کہ ان کے مکان کے اندر ایسا سا ٹانٹھا کہ نہ تو کسی کے بولنے کی آواز آتی تھی اور نہ رونے کی۔ گھر کے اندر سے کچھ آدمی نکلتے ضرور تھے مگر ان کے چہرے اور دوسری حرکات سے کسی قسم کی تشویش کے آثار نہیں پائے جاتے تھے اور نہ ان کے ہاتھوں میں دواؤں کی شیشیاں ہوتی تھیں۔ اس لئے میری الجھن بڑھتی جاتی تھی۔ ان کے مکان کے قریب لے دے کے صرف ایک بنے کی دوکان تھی جہاں گاہکوں کی اتنی کثرت رہتی تھی کہ میں کچھ پوچھتے ہوئے جھجکتا تھا۔

ایک شام کو سڑک کی لالٹین کی مدھم روشنی میں ایک درخت کے نیچے ٹھیک ان کے مکان کے سامنے کھڑا ہوا میں حسب معمول جا سو سی کر رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے آکر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ پیشتر اس کے کہ میں مڑوں

نوارونے سلسلہ کلام بھی جاری کر دیا۔

”کئے آپ کی گھڑی مل گئی؟“

میں نے پلٹ کر دیکھا تو میرا خون خشک ہو گیا۔ کیونکہ یہ شخص وہی تھا جس کا سامنا میں نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”جی جی“ میں نے گھبرائے ہوئے کہا۔ اس کے بعد اپنے حواس ٹھیک کرتے ہوئے میں نے اپنی گردن کو نفی میں ہلا دیا۔

”وہ مجھ کو دیکھ کر بھاگنے کیوں لگا تھا۔“

میں ان کے اس سوال پر قہقہہ مار کر ہنستا تھا کہ اس دوران میں مجھے ان کے اس مبیاختہ سوال کا جواب سوچنے کے لئے تھوڑا سا وقت مل جائے۔ اس کے بعد میں نے جواب دیا کہ میں نے اس کو دھکی دی تھی کہ اگر تم میری گھڑی وہاں دو گے تو میں تمہیں اپنے دوست کے جو خفیہ پولیس کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ ہیں حوالہ کر دوں گا۔

”قہقہہ“ وہ ہیٹ پکڑ کر ہنسنے لگے۔

”کئے آپ کے خسر کا کیسا مزاج ہے؟“ میں نے اس موقع کو غنیمت جان کر سوال کیا۔

”اللہ مالک ہے۔“ انھوں نے اس مایوسی سے کہا کہ میرے چہرے پر بے اختیار مسکراہٹ کی لہر دوڑ گئی جسے شکر ہے خدا کا کہ انھوں نے دیکھا نہیں،

”اچھا آداب عرض ہے۔“ کہہ کر میں وہاں سے روانہ ہو گیا۔

میرا اس طرح بموقع کھڑے ہو کر ایسے غیر مناسب وقت پر عین ان کے مکان کے سامنے جا سوسی کرنا بادی النظر میں ہر شریف شخص کو اشتباہ دلا سکتا تھا۔ اس لئے میں نے اس دن سے ارادہ کر لیا کہ اب اس طرف کبھی نہ جاؤنگا۔ دو روز تک تو اس عہد پر قائم رہا مگر تیسرے روز طبیعت نہ مانی۔ اپنی خالی جیب اور خالی مکان کو جس میں چوہے قلا بازیاں کھا رہے تھے دیکھ کر ہم کو پھر اضطراب ہوا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم کشاں کشاں پھر اسی طرف چلے۔ جب ہم اس محلے میں پہنچے تو کچھ عورتوں کے رونے بیٹنے کی آواز ہمارے کان میں آئی جیسے جیسے ہم ان کے مکان کے قریب پہنچتے جاتے تھے ان آوازوں کا شور بھی بڑھتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ جب ہم دروازے کے قریب پہنچے ہیں تو معلوم ہوا کہ سارا مکان عورتوں سے بھرا ہوا ہے جو گریہ بکا اور آہ وزاری میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ اندر روشنی بھی زیادہ تھی اور کبھی کبھی دو ایک مردوں کی بھاری چیخوں اور آہوں کی آواز بھی عورتوں کی باریک آوازوں میں ملی جلی سنائی دیتی تھی۔ اب تو کوئی شک ہی نہ رہا۔ ہم کو یقین ہو گیا کہ آج وہ بڈھ اہل بسا — ادھر ہمارے کانوں میں یہ آوازیں آرہی تھیں اور ادھر ہماری آنکھوں کے سامنے سے پردے اٹھ رہے تھے — ہم خود کو دیکھ رہے تھے کہ ہم ایک دفتر میں کونے کی میز پر بیٹھے ہوئے چپراسیوں پر حکم چلا رہے ہیں۔

ہم نے وہاں زیادہ ٹھہرنا مناسب سمجھا اس لئے وہاں سے بے تحاشہ بھاگے اور راستے میں سے عرضی لکھنے کا کاغذ خریدتے ہوئے گھر پہنچے۔ اسی وقت ہم نے ایک عرضی اس دفتر کے بڑے افسر کے نام لکھی۔ جس میں جگہ خالی ہونے کا مکمل ثبوت دینے کے لئے ہم نے متوفی کلرک کا نام اور اس کی موت کا واقعہ بھی تحریر کر دیا۔ آخر میں اپنی لیاقت، غربت اور شرافت کا احوال لکھ کر ان سرٹیفکیٹوں کو بھی نتھی کر دیا جو ہم کو ایسے آدمیوں سے ملے تھے جنہوں نے ہم کو آج تک کبھی دیکھا بھی نہ تھا۔

جس طرح شمع پروانوں کو کھینچتی ہے اسی طرح نوکری نوکروں کو اپنی طرف گھسیٹتی ہے۔ اسی خیال سے میں وہ عرضی لے کر جلد از جلد دفتر پہنچ گیا تاکہ دوسرے درخواست کرنے والوں سے میرا نمبر اول رہے۔

”آج تو جگہ خالی ہے“ کہہ کر میں دفتر میں داخل ہو گیا اور سامنے بیٹھے ہوئے کلرک سے اس امر کی بابت استفسار کرنے لگا۔

”آخر روز روز پوچھنے سے کیا فائدہ۔ جگہ کا خالی ہونا آسان نہیں ہے۔“ اس نے تیز لہجہ میں جواب دیا۔

واقعی ہم کو اس وقت بہت غصہ آیا کہ یہ کیسا دفتر ہے جس میں کلرکوں کی موت اور پیدائش کی خبر تک نہیں آتی۔ مگر ہم غصہ کو محض اس خیال سے پی گئے کہ ہو سکتا ہے کہ مرحوم نے مرنے سے قبل اطلاع نہ کرائی ہو یا انہوں نے

اس امر کی وصیت کی ہو اور کسی نے ابھی تک اس کی تعمیل نہ کی ہو۔
 ”جناب آپ کیوں ناراض ہوتے ہیں۔ کیا آپ کو نہیں معلوم کہ کل
 ہی جگہ خالی ہوئی ہے۔“

”کس کی؟“
 ”اُن صاحب کی جو وہاں کونے میں بیٹھے کھانا کرتے تھے۔“
 ”کون؟ رحمت علی صاحب۔“

”جی ہاں۔“
 ”کیوں؟ کیا انہوں نے استغفیٰ دیدیا۔“
 ”نہیں بلا استغفیٰ اور بغیر نوٹس کے۔“
 ”کیسے؟“

”کل اُنکا انتقال ہو گیا۔“
 ”ارے یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“
 ”واقعہ عرض کرتا ہوں، میرے سامنے ہی ان کا انتقال ہوا ہے۔“
 ”افسوس۔ انا للہ۔ ہا۔“
 ”یہ عرضی حاضر ہے۔“

”جناب میں عرضی ورضی نہیں لے سکتا۔ ایسا ہی ہے تو آپ بڑے
 باجوہ صاحب کے دفتر میں بیٹھے۔“

”بہتر ہے۔ بتا دیجئے کہاں؟“

اُس کلرک پر اس واقعہ کا اتنا اثر ہوا کہ اس کی آنکھیں پر آب ہوئیں بہر حال ہماری مروت سے وہ ہیں ہیڈ کلرک کے دفتریں لے گیا اور وہاں کرسی پر لے جا کر بٹھا دیا۔ تقریباً ایک گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد اس دفتر کے ناخدا تشریف لائے جن کے سامنے میں نے اپنی عرضی بصدا دب رکھ دی۔ وہ عرضی پڑھتے جاتے تھے اور سُکراتے جاتے تھے یہاں تک کہ پوری ختم کر لینے پر کرسی پر دراز ہو کر میری طرف مخاطب ہوئے۔

”آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ رحمت علی صاحب کا انتقال ہو گیا۔“
”وہ سخت بیمار تھے۔“

”خوب ان کی بیماری سے آپ نے نتیجہ نکال لیا کہ وہ مر گئے۔“

”نہیں جناب کل ان کے گھر میں بہت زبردست رونا پیٹنا ہو رہا تھا۔“

”اچھا، تب تو کوئی شک ہی نہ رہا۔ افسوس، رحمت علی صاحب بہت اچھے آدمی تھے۔ مجھے ان کی یاد میں اس دفتر کو آج بند کرنا پڑ گیا۔ اس لئے آپ کل تشریف لائیگا۔ میں آپ کی عرضی رکھے لیتا ہوں۔“

”آپ کا بہت بہت شکریہ۔“ کہہ کر میں اٹھا ہی تھا کہ انھوں نے ہاتھ کے اشارے سے روک کر مجھے پیٹھے رہنے کا حکم دیا۔

”دیکھئے میں آپ کا معاملہ ابھی طے کئے دیتا ہوں۔“

انہوں نے گھنٹی بجائی، چپراسی جی حضور کتنا ہوا اندر داخل ہوا۔ انہوں نے اس کے کان میں کچھ کہا۔ جس کو سن کر وہ باہر چلا گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں چلن سٹی اور وہی نوجوان بالو اندر داخل ہوا جس نے میری یہاں تک رہبری کی تھی۔ وہ مجھ کو دیکھ کر گھورنے لگا اور کچھ کہے بغیر کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد اُس متوفی کلرک کا داماد داخل ہوا جسے دیکھ کر میں ذرا گھبرا گیا اور رومال نکال کر پسینہ پونچھنے لگا۔ ابھی وہ بیٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ چک پھر ہی اور اس مرتبہ وہ شخص داخل ہوا جسے دیکھ کر میں ”ہائیں“ کہہ کر بے اختیار اچھلا اور پھر دھڑام سے کرسی پر گر گیا۔ ارے یہ تو وہی بڈھا کلرک تھا جس کو میں مردہ خیال کئے ہوئے بیٹھا تھا اور جس کے ماتم کی آوازیں میں خود اپنے کانوں سے سن کر آیا تھا۔ اگر کہیں تنہائی میں ملاقات ہوتی تو میں اس کو روح کا مجسمہ خیال کر کے ڈر سے آنکھیں بند کر لیتا۔ مگر یہاں تو اس کا امکان ہی نہ تھا کیونکہ پہلے کی نسبت وہ کافی تندرست تھا۔ میرا بند بند کانپنے لگا۔ آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا سارا بدن پسینہ سے شرابور ہو گیا۔ نجی چاہتا تھا کہ اُٹھ کر یہاں سے بھاگ جاؤں۔ مگر پیرسن، من بھر کے ور فی معلوم ہوتے تھے۔ ایک تو نوکری نلنے کی نا امیدی اور دوسرے دفتر کی ندامت۔ یا اللہ کس میں طاقت ہے کہ ان دو مصیبتوں کو اٹھائے۔ بہر حال گردن جھکائے آنکھیں پینٹی کئے میں کرسی پر بیٹھا ہی رہا یہاں تک کہ سارا کمرہ بالوؤں سے بھر گیا۔

”رحمت علی صاحب“ ہیڈ کلرک نے مخاطب ہو کر کہا۔ ”میں آپ کو غسل صحت پر مبارکباد دیتا ہوں۔“ انھوں نے اٹھ کر ان سے ہاتھ ملایا۔ اس کے بعد وہ مسکرا کر پوچھنے لگے کہ ”کل رات آپ کے یہاں یہ کیسا ہنگامہ تھا؟“

”جی! رحمت علی صاحب کہنے لگے۔ ”کل میرا غسل صحت تھا۔ عورتوں نے منت مانی تھی کہ جب میں اچھا ہو جاؤنگنا تو مجلس امام حسینؑ منعقد کر سکی۔“

یہ سن کر ہیڈ کلرک نے میری طرف رخ کر کے رحمت علی صاحب سے کہا۔ ”دیکھئے آپ سے ملے بس آپ کے نادیدہ مشتاق ہیں۔ خاص آپ ہی کیلئے تشریف لائے ہیں۔“

وہ میری طرف بڑھے۔ جھکوبھی مجبوری کر سی چھوڑ کر کھڑا ہونا پڑا۔ میں نے اپنا کا پتہ ہوا ہاتھ ان کی طرف بڑھایا۔ انھوں نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں لیا کچھ الفاظ کہے۔ مگر میں جلدی سے فوراً چپک ہٹا کر باہر نکل آیا۔

(زینتِ خیال)

ہل چل

اشخاص ڈرامہ

لطفہ	بہنیں	
سعیدہ		
کینیزہ		
نمودہ		لطفہ کی سولہ برس کی لڑکی۔
نجیمہ		سعیدہ کی تیرہ برس کی لڑکی۔
عزیزہ		لطفہ کا اٹھارہ برس کا لڑکا۔
رفقہ		سعیدہ کا سات برس کا لڑکا۔
مستنا		تیرہ برس کا چھوٹا لڑکا۔
ڈاکٹر		

نوٹ:- یہ نام سب فرضی ہیں۔
 جائے وقوع - ہندوستان کا ایک شہر
 اشخاص ڈرامہ کی حیثیت - شریف طبقہ، خوشحال تعلیم یافتہ اور مذہب پرانی وضع کے پابند۔

وقت — اپریل سے پہلے
 مکان — پختہ، باہر سے شاندار، لیکن اندر سے استرکاری اور سفیدی
 سے محروم کبھی جگہ سے انہیں اپنے شکستہ اور پرانے دانت دکھائی دیتے
 خاکہ — شمالی سمت، دالان در دالان،

جنوبی سمت، بیرونی دروازہ۔ ڈیوڑھی۔ کمرہ
 مشرقی سمت، باورچی خانہ۔ طہارت خانہ۔ حمام
 مغربی سمت، دُہرا کمرہ
 صحن۔ کشادہ

ایک پٹلا

سینا

تعارف :- [صحن میں تخت بچھا ہوا ہے جس پر ایک مضامہ بیٹھی ہوئی چھالیہ کتر رہی ہیں
 قریب کے پلنگوں پر طوطے کا بیجڑہ۔ چھوٹا بچہ، مرغیاں، کبوتر، کھانے کے برتن وغیرہ علی الترتیب
 رکھے ہوئے اور بیٹھے ہوئے ہیں۔ ملحقہ چھوٹی چوکی پر ایک اوسط العمر خاتون بیٹھی ہوئی وضو کر رہی
 ہیں۔ باورچی خانہ میں خادمہ برتن مانجھ رہی ہے اور ایک صاحبزادی سالن بھون رہی ہیں۔

مکان سے باہر سڑک پر سے ایک وٹرا آہستہ آہستہ آتی ہے اور مکان مذکورہ کے سامنے
 رک جاتی ہے اس کے اندر سے ایک شریف آدمی نکلتا ہے اور سیٹ پر سے ہینڈ بیگ اٹھا کر

دروازے کی طرف رخ کرتا ہے۔ زنجیر ہلا کر اپنی آمد کی اطلاع دیتا ہے اور فوراً ہی رخ پھیر کر مخالف سمت میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ دھوپ اس کے تمام جسم پر پڑ رہی ہے۔ چہرے کو بچانے کے لئے ہیٹ کو نیچے سرکا دیتا ہے۔ [

لطیفہ۔ (زنجیر کی آواز سن کر) مسیتا! باہر دیکھ کون ہے؟
[مسیتا باہر جاتا ہے اور گھبراہٹ ہو کر واپس آتا ہے]

مسیتا۔ ارے ڈاکٹر صاحب ہیں۔

عزیز۔ (باواز) جلدی پردہ کرو جلدی (آہستہ) میں نے اپنا پائجامہ کھونٹی پر لٹکا دیا تھا۔ ملتا ہی نہیں۔

نعیمہ۔ بھائی جان وہ دھوبن لیگئی ہے۔ ابھی تو گئی ہے۔

عزیز۔ (مضطربانہ) غضب کر دیا۔ لو اب ہمارے پاس کوئی پائجامہ ہی نہیں ہے
واٹسنگ کمپنی سے ابھی کپڑے نہیں آئے (تیز ہو کر) آخر پوچھ تو لیا ہوتا ہی
اب کیا میں ڈاکٹر کے سامنے لنگی باندھے جاؤں (رخ پھیر کر) پردہ ہو گیا کیا۔

(صحن میں آکر) آخر یہ ابھی تک کیا ہو رہا ہے؟

نعیمہ۔ پردہ کا سامان،

محمودہ۔ ذرا سا گوشت بھون لوں تو اٹھتی ہوں۔

لطیفہ۔ ذرا سا زردہ کھالوں۔

کینیزہ۔ ذرا سی لنگھی کر لوں۔

سعیہ - (نماز میں بولتے ہوئے) ذرا سی نماز پڑھ لوں۔
 نعیمہ - (تہنہ لگاتے ہوئے) دوبارہ شروع کیجئے گا یا اسی کو جوڑ لیگا۔
 سعیہ - (ہونٹوں پر انگلی رکھ کر) ہونہ، خاموش،

[زنجیر ہلانے کی آواز دوبارہ آتی ہے جس کو سن کر سب پڑھنی طاری ہوتی ہے]
 عزیز - (دانت بھیج کر) ارے صاحب خدا کے لئے پردہ کر لیجئے۔ بندہ نے گھنٹہ
 بھر پہلے پیشین گوئی کر دی تھی کہ ڈاکٹر آنے والا ہے۔ تیار ہو جائیے گا
 باہر دھوپ میں کھڑا کھل رہا ہو گا بیچارہ۔

کینزہ - (چوٹی میں موباف کی جگہ کمر بند باندھتے ہوئے) ارے بھئی ہاتھ پیر کیوں
 پھلائے دیتے ہو، ابھی ہوا جاتا ہے پردہ۔ آخر تم باہر جا کر ڈیوڑھی میں کیوں
 نہیں بٹھاتے۔ ذرا کہہ آؤ کہ ابھی بلاتے ہیں۔

عزیز - وہ پانچامہ جو دیدیا گیا ہے ہمارا دھوبن گنجت کو۔
 لطیفہ - بس پانچامہ کی جان کو رو رہے ہیں۔ سنتے سنتے کان پک گئے۔
 پانچامہ، پانچامہ - ماتم کرو۔

عزیز - (غصہ میں) سیتا! بلالے ڈاکٹر کو، اچھا ہے۔ آج ان لوگوں کا سامنا ہو جائے
 [سیتا باہر جاتا ہے۔ اسی وقت زنجیر ہلانے کی آواز تیزی سے آتی ہے اور تواتر

چند منٹ تک سنائی دیتی ہے]
 محمود - کاش یہ ڈاکٹر اندھا ہوتا یا میں، —

(جلتی پتیلی کو کسی کپڑے کی مدد کے بغیر اٹھانے کی کوشش کرتی ہے اور جب زبردست چیکا لگتا ہے تو چیخ مارتی ہے اور پتیلی کو دونوں ہاتھوں سے زمین پر ٹپک دیتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سب گوشت الٹ جاتا ہے۔ اُر میرے اشد کہہ کر چلے ہوئے ہاتھوں کو پانی کی پتیلی میں ڈبوئی ہے) ہاتھ چل جاتے ہیں۔ دل بہن جاتا ہے۔ گر شدت کے پرے پر آج بھی نہیں آتی۔

لطیفہ۔ (سر پیٹ کر) ہے ہے کیا کروں۔ (گھبرا کر تخت سے اترنے کی کوشش کرتی ہے اور پاندان کو زنجیر لگائے بغیر ہی اٹھاتی ہے۔ کٹھیاں، ڈبیاں قلابازی کھاتی ہیں اور کتھے چومنے، تمباکو اور چھالیہ کا ایک اعلیٰ درجہ کا کچھر تیار ہو جاتا ہے) اونی (غصہ سے کانپ کر) عزیز تم پر خدا کی مار۔

عزیز (ہنس کر) خدا نہ کہے۔ (زیر لب) فعل بد تو خود کریں لعنت کریں شیطان پر۔ سعیدہ۔ (اس موقع پر نماز پڑھنے میں مشغول تھیں۔ رکوع کو توڑ کر سبحان ربی اعظیم کہتی ہوئی اپنی ہمیشہ کلاں کی مدد کرنے کو ٹرتی ہیں) عزیز خدا تم کو بن بیاہا ہی رکھے (بیڑوں سے جوتا تلاش کرتے ہوئے) توبہ! یہ جوتہ کون پہن گیا۔

کینزہ۔ (پلنگے اٹھتے ہوئے اور آدمی گندھی ہوئی چوٹی کو ہاتھ سے پکڑے ہوئے) اس گھر میں سب بیروں کے اندھے ہیں میرا جوتہ بھی کوئی پہن گیا۔

سعیدہ۔ پھر تم کس کا جوتہ پہنے ہوئے ہو؟

کینزہ۔ (تعجب ہو کر) لے ہے یہ آپ کا جوتہ ہے۔ میں سمجھتی تھی کہ میرا ہے (لوٹا

اٹھتے ہوئے) ذرا چوکی پر ہواؤں تو دیتی ہوں۔
 سعیدہ۔ (نیز ہو کر) میں اس وقت تک کھڑی رہوں گی کیا؟
 کینزہ۔ (ہنس کر) آپ باقی نماز پڑھ لیجئے جب تک۔
 لطیفہ۔ تم کو بھی بے وقت کاراگ سوچنا ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی چوکی پر جانے کا
 موقع ہے۔ ڈاکٹر جو کھڑا ہے۔
 کینزہ۔ پہلے آپ کتنا چو نہ علیحدہ کر لیجئے۔
 [میتا باہر سے گھرایا ہوا آتا ہے]

میتا۔ ڈاکٹر گیا۔
 عزیز۔ اچھا ہوا گیا۔
 سعیدہ۔ ہے ہے۔ کہاں تک ٹھہرتا؟
 لطیفہ۔ موئے روکا بھی نہیں۔
 سب۔ ارے دوڑ، ارے دوڑ،
 میتا۔ (وقفہ لگا کر) ڈاکٹر صاحب آتے ہیں پر دے والیو، پردہ کر لو۔
 سب۔ رذات ڈرا دیا، اچھا بلاؤ۔

ردہ ہٹتا ہے اور ڈاکٹر کی تپلون گھر کے اندر داخل ہوتی ہے
 سب سر پر پر رکھ کر شمالی سمت کے دالان کی طرف بھڑیئے سے
 ڈری ہوئی بکریوں کی طرح بھاگتے ہیں،

سب - مسیتا روک، روک،

لطیفہ - (ہانپتے ہوئے) پردہ ڈال دے۔

مسیتا - الگنی کہاں ہے - رستی کسی نے کھول لی۔

کینیزہ - کسی نے کھول لی ہوگی - دوسری باندھ دو۔

مسیتا - کیل کہاں ہے - کسی نے گرا دی۔

سجیدہ - کینیزہ نے کپڑے لٹکانے کو نکال لی تھی - دوسری ڈھونڈو۔

لطیفہ - اللہ ہی تمہارے عیبوں کا پردہ رکھے۔

[کیل ٹھوکی - رسی تانی، پردہ لٹکایا جب ڈاکٹر اندر آیا۔ مگر اسی وقت محمودہ جو

اپنے جلے ہوتے ہاتھ پر آلوپیس کر تھوپ رہی تھی ڈاکٹر کو روبرو دیکھ کر صحت خانہ

میں جو قریب ہی واقع ہے چھلانگ مار کر پناہ گزیں ہوتی ہیں۔]

عزیزہ - (ڈاکٹر کو دیکھ کر شرماتے ہوئے) آداب عرض ڈاکٹر صاحب، معاف کیجئے گا۔

(مسیتا سے) کرسی۔

کینیزہ - (پردہ میں) کرسی۔

نعیمہ - (پردہ میں) کرسی۔

لطیفہ - (آہستہ سے) کرسی پر مرغی نے.....

عزیزہ - (باہر سے) قلم دوات۔

مسیتا - (چچ کر) قلم دوات۔

نغمہ - (پردہ میں) قلم دوات -
ڈاکٹر - مت تکلیف کرو - فاؤنٹین پن ہے -

[ڈاکٹر مغربی سمت کے کمرے میں داخل ہو کر تمام سالان پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتا ہے اور چہرے پر تنفر کے آثار لاتا ہے۔ کھڑے پتنگ پر ایک سات برس کا بچہ چادر اوڑھے لیٹا ہے۔ پتنگ کے پیچھے تڑپتی ہوئی ہے۔ جو کھیلوں کی آبادی کے لئے ضیافت کا کام دے رہی ہے۔ اس کے قریب پانی کا ٹوٹا رکھا ہے۔ پتنگ کے دوسری طرف کچھ اور پڑا ہوا ہے جس کے قریب کھڑی ہوئی مرغی لپٹی کا ہوسٹا دیکھ رہی ہے۔]

غزیرہ - (مریض کی طرف اشارہ کر کے) یہ بڑے ذات شریف ہیں۔ رات بھر بخار میں ہل ہلاتے ہیں اور دن بھر چلچلاتی دھوپ میں تپنگ کے پیچھے پیچھے بھاگے پھرتے ہیں۔ سڑک پر سے جتنے خواہنے والے گزرتے ہیں ان سے اُلا بلالے کر لکھاتے ہیں۔ رات کو بخار بہت تیز تھا۔ آج دن کو بخار نہیں آیا

[باورچی خانے کے قریب سے شیشی کی آواز آتی ہے۔ عزیز اپنے کلام کو منقطع کر کے دیکھتا ہے اور جب وہاں پر کسی کو نہیں پاتا تو پھر اپنا کلام جاری کرتا ہے۔] سیتا جانا! محمودہ - (اپنی مائے پناہ سے) اواندھے، ارے ادھر، ادھر دیکھ، میں کب سے یہاں قید ہوں۔

سیتا - (وقفہ لگاتا ہے) ابھی کھڑی رہو، ڈاکٹر چلا جائے تب نکلیو۔

محمد ۵۔ اچھا تو بڑی بیگم سے عطر کی شیشی لا کر دے جا میرا دماغ پھٹا جاتا ہے۔

[سینا واپس آ جاتا ہے]

ڈاکٹر۔ (عزیز سے) بیماری کو کتنے روز ہوئے؟

عزیز۔ تقریباً ایک ہفتہ (دالان کے اندر سے تالی بجانے کی آواز آتی ہے۔ عزیز پردہ کے پاس جاتا ہے) کہئے۔

لطیفہ (باداز بولتی ہے تاکہ ڈاکٹر بھی سنے) ہیں دس روز ہوئے اس کے بخار کو۔

سعیدہ۔ (قطع کلام کرتی ہیں) آپ ہیں کس خیال میں جمعہ جمعہ آٹھ، ہفتہ نو، اتوار دس پیر گیارہ شگل بارہ، بدھ تیرہ، آج چودھواں روز ہے۔ شاید بحران کا دن ہے۔

عزیز۔ (واپس آکر) بیانات مختلف ہیں ڈاکٹر صاحب،
ڈاکٹر۔ (مسکرا کر) کتنے دست کل ہوئے تھے۔

عزیز۔ ہم نے گنے نہیں،

لطیفہ۔ (زور سے) ڈاکٹر صاحب بچیں آئے تھے۔

سعیدہ۔ (آہستہ) اے نہیں باجی غضب کرتی ہو (باداز) ڈاکٹر صاحب
پردہ سے زیادہ نہیں تھے۔

نعیمہ۔ (چپکے سے) دن بھر آیا کئے۔ اماں میں سے زیادہ تھے۔

لطیفہ۔ (جھنجھلا کر) ٹھیک کہتی ہے بچی۔ سعیدہ کو تو جھٹلانے کی عادت ہے،

(باواز) میں تھے ڈاکٹر صاحب، بلکہ اس سے بھی دس پانچ زیادہ۔

ڈاکٹر۔ رنگ کیساتھا۔

عزیز۔ دیکھئے پوچھتا ہوں۔ گواہوں کے بیان پر فیصلہ ہوگا۔

لطیفہ۔ (پردہ کے پاس آکر) ٹیلے رنگ کے تھے۔

نجمہ۔ اے ہرے ہرے تھے خالہ اماں۔

لطیفہ۔ ہاں! نہیں ڈاکٹر صاحب ٹیلے نہیں ہرے رنگ کے تھے۔

کنیزہ۔ ایک ہرے رنگ کا تھا۔ باقی سب ٹیلے تھے۔

لطیفہ۔ (فاتحانہ انداز میں) میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ ٹیلے رنگ کے تھے

بھئی ٹیلے رنگ کے تھے۔ سنتے ہو بیاعزیز۔

عزیز۔ معاملہ مشکوک نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر۔ پیشاب ہوا تھا؟

عزیز۔ مجھ کو نہیں معلوم۔

لطیفہ۔ ہم کو نہیں معلوم۔

سعیدہ۔ ہم کو نہیں معلوم۔

کنیزہ۔ ہم کو نہیں معلوم۔

نجمہ۔ اے پیچھے اتنا نہیں معلوم۔ رات کو بستر ہی پر پیشاب کیا۔

جو دری ہٹانی پڑی تھی۔

لطیفہ۔ ہاں ہاں یاد آیا کیا تھا؟

سعیدہ۔ کیا تھا!

کنیزہ۔ کیا تھا۔

محمودہ۔ (اپنی جائے پناہ سے) وہ ننھے بھیا کا پیشاب تھا۔ رن کا نہیں تھا بھئی۔

سب۔ (بیک آواز) ٹھیک کہتی ہیں۔ پیشاب نہیں ہوا تھا۔ پیشاب نہیں ہوا تھا۔

(ڈاکٹر رفیع کو جھجھلا کر دیکھتا ہے۔ تھرمائیٹر لگاتا ہے۔ بنف پر ہاتھ رکھتا ہے،

زبان دیکھتا ہے اور کھڑے کھڑے نسخہ لکھنے میں مشغول ہو جاتا ہے۔)

لطیفہ۔ عزیز میاں! ڈاکٹر صاحب سے کہنا کہ دوا بیٹھی لکھیں۔ کڑوی دوا نہیں پئے گا۔

سعیدہ۔ بہت کمزور ہو گیا ہے۔ پہلے قوت کے انجکشن دیں۔

کنیزہ۔ ہاں، ہاں اس کا بہت خراب ہے۔

نعیمہ۔ بھوک لگتی ہی نہیں۔

عزیزہ۔ (زیر لب) اب کیا مجھ کو کھائے گا (آواز) اطہیان رکھئے کلا چلے ستر بلا ٹیلے کے ہول پر پہلے ہی سے عمل کرتا ہے۔

(ڈاکٹر خاموشی سے بیگ اٹھاتا ہے۔ فیس ایک ہاتھ سے لیتا ہے۔ اور دوسرے

ہاتھ سے نسخہ عزیز کو دیتا ہے۔ کچھ مختصر ہدایات کرتا ہے اور کمرے سے

نکل کر صحن میں آتا ہے۔)

لطیفہ۔ (کراہے) ڈاکٹر صاحب کو روک لینا ابھی مجھے بھی نبض دکھانی ہے۔

سچیہ۔ ۵۔ (انگڑائی لیک) میرا بھی ایک ہفتہ سے سر درد کرتا ہے۔

کنیرہ۔ ۵۔ (کزور آواز میں) مجھ کو خنلاج قلب بہت بڑھ گیا ہے ڈاکٹر صاحب۔

لطیفہ۔ ذرا دم تو لو۔ ڈاکٹر صاحب کہیں بھاگے نہیں جاتے ہیں۔ جیسے طب میں بیٹھے ویسے یہاں بیٹھے۔ اطمینان سے حال کہو۔

نعیمہ۔ میری ناک میں پھنسی نکل آئی ہے۔

مستیبا۔ مجھے بھوک بہت لگتی ہے ڈاکٹر صاحب۔ بیوی کہتی ہیں کہ یہ بڑا سخت مرض ہے۔

عزیزہ۔ اگر ہرج نہ ہو تو مجھے بھی دیکھ لیجئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میرے دماغ میں گھن لگ گیا ہے۔

ڈاکٹر۔ (علیحدہ) تبدیل خاندان کرو (منہ کر) اور کوئی باقی ہے۔ محلہ میں بھی دریافت کرا لیجئے۔

[ہر ایک کو جلدی جلدی دیکھتا ہے۔ نسخہ لکھتا ہے اور پرچوں کو اکٹھا کر کے

عزیزہ کے ہاتھ میں دیدیتا ہے۔ پھر بیگ اٹھاتا ہے اور وہاں سے ہوا ہوجاتا

ہے۔ عزیزہ اس کے جانے کے بعد نسخوں کی تقسیم کرتے ہیں اور کنیرہ کو اس

کے نسخے کے ساتھ رفقہ کا نسخہ بھی دیدیتے ہیں]

عزیزہ۔ (نسخہ دیکر) احتیاط سے رکھئے گا۔

لطیفہ۔ سینا دوڑ ! دوڑ ! یہ دوا گرمی تو نہ کرے گی۔ (سینا دوڑ)

کی طرف لپکتا ہے]

کنیزہ۔ رُک رُک ! (سینا رُک جاتا ہے) پوچھتے آنا کہ میں کیا کھاؤں؟
(سینا لپکتا ہے)

سعیدہ۔ ارے اوہرے، ہے سنتا ہی نہیں، (سینا پھر وہاں آتا ہے)
میں خرلوزے کھاؤں کیا (سینا پھر لپکتا ہے)

کنیزہ۔ (دوڑ کر اس کا ہاتھ پکڑتی ہے) خرلوزوں کو میرے لئے بھی پوچھ لینا۔
[اسی اثناء میں موٹر سے ہارن کی آواز آتی ہے۔ اوڑھیوں

کے گرگر گڑاہٹ کی آواز سنائی دیتی ہے۔]

لطیفہ۔ (مضطرب ہو کر) لو ڈاکٹر گیا۔

سعیدہ۔ سب مریض بن گئے تھے۔ اس گھر میں بیماریاں اُبل پڑی تھیں۔
کنیزہ۔ ڈاکٹر بھی جراثیم کی پوڑیہ ہے اس کے کُتے سے پہلے
اچھے خاصے تھے۔

سعیدہ۔ تم ہی بیچاری ایک مریض تھیں۔ شاید دفن بھی تندرست تھا۔

کنیزہ۔ میرا تو شاہانہ مرض ہے۔ احتیاجِ قلب۔

سعیدہ۔ نسخوں کی ہوا پھانکتی رہو۔ تندرست ہو جاؤ گی۔ کوئی ٹکٹ
جمع کرتا ہے۔ کوئی تست لیاں جمع کرتا ہے۔ ہماری بہن صاحبہ کو

نسخہ جمع کرنے کا شوق ہے خدا خیر کرے۔

کینیزہ - ہم کوئی سدا روگی تھوڑی ہیں جو ہر وقت منہ سے شیشی لگی رہے۔

سعیدہ - پھر کیوں ڈاکٹروں کے سامنے پیش پیش رہتی ہو۔

کینیزہ - (غیض و غضب میں) آخر آپ میرے پیچھے کیوں پڑ گئیں۔ فوج میں نے

آپ کے ڈاکٹر کو دکھایا۔ مواکپونڈر کی دم۔ لیجئے اپنا نسخہ (ایک نسخہ کو

پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتی ہے) میں ایسے ویسوں کی خود دوا نہیں مٹی۔

(دوسرا نسخہ عزیز کو دیتی ہے) لور فن کا نسخہ خود رکھو۔

عزیزہ - (نسخہ پر نام پڑھ کر) لو غضب ہو گیا۔ (پچھے ہوئے نسخے کے ریزوں کو اٹھاتا ہے)

ارے یہ رفن کا نسخہ تھا۔ رفن کا۔ اسے آپ نے پھاڑ ڈالا۔ میری شامت

انماں تھی کہ آپ کو احتیاط سے رکھنے کو دیا۔ (سر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر)

بھئی ان سب نے تو ہم کو دیوانہ اور پاگل بنا دیا ہے، دماغ کو گھٹن لگ گیا ہے

جس مریض کیلئے خاص طور پر ڈاکٹر بلوایا گیا وہی بلا دوا کے رہ گیا۔ بارالہا

(آسمان کی طرف دیکھتا ہے) اگر تیرے خزانہ میں عقل کا ٹاک ختم ہو گیا ہو تو

یورپ کی عورتوں سے تھوڑی سی چھین کر ہماری ہندوستانی کہنوں میں

سے ہر پردہ دار کو حصہ رسد بانٹ دے۔ ورنہ دوسرے جنم میں ہم مردوں کو

یورپ کی سرزمین میں پیدا کر۔ خواہ کسی شکل میں۔

(ڈراپ) ~~~~~ (عصمت)

داڑھی

یوں تو عرصہ دراز سے ہم داڑھی کے لذیذ دسترخوان پر مہیون ضیافت ہوتے ہیں اور اس اہم عنوان پر منہک تحریر — لیکن خاص طور سے ہم چند ماہ قبل اس کے متعلقات پر اپنی تحقیق و تفتیش کو ختم کر کے اپنی زیریں معلومات کو چھاپے خانے کی نذر کرنے کا ارادہ کر رہے تھے کہ اسی ماہ کے نیزنگ خیال میں پروفیسر غلام سرور صاحب ایم۔ اے کے اسی مضمون پر ایک بسیط علمی مقالے کو دیکھ کر قریب تھا کہ ہم بہوش ہو کر ہوش میں آجائیں کیونکہ یہ مسئلہ اب وہی حیثیت رکھتا ہے جو ایک ہی ایجاد کے دو دعویداروں کی صورت اختیار کر چکا ہو۔ مگر اس خصوصیت کے ساتھ کہ ان میں سے ایک کو Patent حق انکار مل چکا ہو اور دوسرے کی سعی ہنوز میدان عمل سے مستغنی رہی ہو، اور صرف خیال ہی کی حد تک محدود ہو۔ البتہ یہ امر غور طلب ہے کہ مسئلہ زنجیشت پر خاتمہ فرسانی کا خیال ہم دونوں میں سے کس کے دماغ میں پہلی بار جاگزیں ہوا،

قطع نظر اس سے کہ یہ فرسودہ داڑھی رسالوں کے چہروں پر اب سے قبل صد ہا با
منو دار ہو چکی ہے۔

خیر، یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ چونکہ پروفیسر صاحب مذکور میرے کسی زمانے میں استاد
شفیق رہ چکے ہیں اس لئے میں داڑھی کے حق اولیت سے دست بردار ہوتے ہوئے
اس مضمون کو ان کے مقالے کے صمیمے کی حیثیت سے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اور
اس عنوان کے استعمال کی جسارت پر معافی چاہتا ہوں۔

جس طرح زراعت اور باغبانی کا ذوق ہر دل میں ایک فطری جذبہ کے
ماتحت پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح داڑھی اگانے کا شوق بھی ہر نوجوان کے دل میں
وداعیت کیا گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان بچوں کی طرح جو زمین میں بوئے ہوئے
بیجوں کو قبل از وقت کرید کرید کر دیکھا کرتے ہیں تمام نوجوان اپنے رخساروں پر
استرے کا ہل چلاتے ہیں تاکہ زمین جلد از جلد زرخیز ہو جائے اور پھل پھلا کر بال نمودار
ہوں۔ داڑھی کے موافقین اس مہمید سے نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ داڑھی اگانے
کے فطری جذبے کو داڑھی کٹوانے اور صاف کرانے کے غیر فطری عمل سے کیوں دبا
دیا جاتا ہے۔ اس کے جواب میں میں ان حضرات کی خدمت میں البصدا د ب عرض کر دینگا
کہ یہی اعتراض کا شکاروں پر بھی عاید کیا جاسکتا ہے جو پختہ اناج کی فصل کو
کاٹ کر زمین کو برابر کر دینے کے مجرم ہوتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہم ہر روز
اور وہ ہر فعل اس عمل کی تکرار کرتے ہیں۔

نوجوانوں کو داڑھی اگانے کا شوق مختلف تحریکات کی بنا پر ہوتا ہے۔
 اولاً نقالی۔ بندر سے لے کر انسان تک تمام جانور فطرثاً اداکار اور نقال
 واقع ہوئے ہیں اگر نقالی معیوب ہے تو تہذیب، تمدن، فیشن، اور سماجی مین
 سے بیک وقت دست برداری کرنا پڑیگی۔

دوئم۔ جدت، ہر جدید تجربہ ہزاروں لذتوں کا حامل ہوتا ہے۔ گالوں
 پر استرے کا پہلی بار اتصال و جدائی اور ہیجانی چیز ہے جس کو کسی دوشیزہ کے
 پہلے پیار سے نسبت دی جاسکتی ہے۔ پانی کی شفاف سطح پر سے کالی کا ٹھٹھا
 چمکتے ہوئے سون کے چہرے سے ابر کی کالی چادر کا پھٹنا۔ تاریک اور گنجان جنگل
 میں یکبارگی بجلی کا ٹرپنا۔ کسی شعلہ رو کے چہرے سے نقاب کا سرکنا یا بارش
 کے پہلے پانی کا گرد آلود پتوں پر گرنا اور کسی نوجوان کا پہلی بار شیو کرانا تاثرات
 اور جذبات کے لحاظ سے برابر ہیں۔ اگر ہمارا یہ فعل گناہ ہے تو ہم تجدید گناہ کے
 ترکیب ہیں تخلیق گناہ کے نہیں کیونکہ آدم اور حوا ہم سے قبل گیموں پر اپنا
 سب کچھ قربان کر چکے ہیں۔

صیت
 سوم۔ فطرت کی تحریک۔ فطرت نے انسان کے رخساروں میں خصوصاً
 سے اعصاب کا ایک باریک اور نازک جال پھایا ہے جن کی وجہ سے ان کی
 سطح بید حساس واقع ہو گئی ہے۔ عالم شباب میں یہ حس بوی شباب پر ہوتی
 ہے اور نوعی و جنسی خواہشات کے مرکز کی مددگار بن جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

اس خاص عمر میں نفرت تخریب پیش کرتی ہے جس کو کسی طرح ٹھکرایا یا رہنیں کیا جاسکتا۔ اس کا واحد علاج جنس مخالف کے رخصاروں کا اتصال ہے۔ جس کی غیر موجودگی میں اُستراکار آمد ثابت ہوتا ہے گویا یہ ہیجان طبع کے لئے تنقیہ ہے بالکل اسی طرح جس طرح گرم جسم کے لئے ٹھنڈے پانی کا غسل یا دھرتے ہوئے قلب کے لئے عرق گلاب۔

چہارم۔ بزرگی کا شوق۔ ابھی بچے ہوئے کے تازیانے اس عمل کو تیز تر انجام دینے کے محک ہوتے ہیں۔ اول بار شیو کے سامان کی خریداری کا اہتمام اور اس کے متعلق معلومات کا انصرام آپ غیر ضروری خیال فرمائیں لیکن اس کا شکرار کے دل سے پوچھئے جو اپنے کھیت کی پہلی فصل کاٹنے جا رہا ہو مگر افسوس کہ یہ تاثرات دیر تک قائم نہیں رہتے۔

شیو کی بچپنی نئی وطن اور نئی ڈگری کی طرح چند ہفتوں تک مسرت کا واحد ذریعہ رہتی ہے اس کے بعد ایک خوشگوار فرض میں تبدیل ہو جاتی ہے کچھ عرصے کے بعد پیر یا سے مدافعت کے لئے کوفین کی گولی کی طرح کڑوا فرض بن جاتی ہے۔ کم و بیش ایک سال میں امتحان کے پرچوں کی طرح سر پر سوار ہو جاتی ہے اور اس کے بعد تمام عمر ایک زبان دراز بیوی، اسکول کی ماسٹری اور لوکل بورڈ کی نوکری کی طرح پلائے ناگمانی بنی رہتی ہے۔ مرد قسمہ پا اس سے کہیں بہتر ہے جس طرح ایک عاشق ہجراں نصیب کہتا ہے کہ عمر بھر میں مجھ پر دو کٹھن وقت

پڑے ہیں۔ اک ترے کنے سے پہلے اک ترے جلنے کے بعد۔ اسی طرح دارھی کے بیمار عرض کرتے ہیں کہ عصاب کی سکرات کا وقت صرف ایک ہی ہوتا ہے اور وہ شیو کرنے کے دوران ہیں۔

مگر اس سخت امتحان کے بعد کیا ہوتا ہے؟ اس کا جواب دینے کے لئے میں آج کل کے نوجوانوں کو بالوں کے مجاہد کی حیثیت سے پیش کروں گا۔ یقیناً جس چیز کو دور کرنے کیلئے اس قدر رحمت اور تکلیف برداشت کی جائے اس کا نتیجہ بھی اسی حد تک خوشگوار ہونا چاہئے اور یہی وجہ ہے کہ دارھی صاف کرانے کی رسم بے انتہا ترقی کر گئی ہے۔ ورنہ اس کے مابعد نتائج اگر مفقود ہوتے تو آج ہر جگہ انسان جھل جھل نظر آتا۔

مجھ سے اگر آپ یہ دریافت فرمائیں کہ دنیا میں کونسی ایسی شے ہے جس سے تم کو بے انتہا سرت ہوگی تو میں اس چالاک فقیر کی طرح ایک مخصوص پیرایہ میں عرض مطلب کروں گا جو اسی قبیل کی صدا لگتا ہے کہ — ”دولت نہیں مانگتا۔“

”ناول نہیں مانگتا۔“ لباس نہیں مانگتا۔ سینا نہیں مانگتا، بس ایک چیز مانگتا ہوں اور وہ استرہ ہے۔ مجھ کو شیو کرنے کے بعد جو اطمینان اور فارغ البالی نصیب ہوتی ہے اس کے سامنے دنیا کی تمام نعمتیں بیچ ہیں۔ بس مجھ کو شیو کر لینے دو۔ اور تم میرے عزیز ترین دوست ہو۔ واللہ اس وقت طبیعت میں جوش ہوتا ہے دل میں امنگ ہوتی ہے۔ جسم میں ایک برقی رو دوڑتی ہے۔ سارا عالم تھرکتا، ناچتا اور

نظر آتا ہے۔ قمقموں کی آمد ہوتی ہے۔ اور نہیں — یہی وجہ ہے کہ میں مضمون نگاروں اور شاعروں کے لئے شیو کو اسی طرح ضروری سمجھتا ہوں جس طرح دل کو۔ اس کے علاوہ وہ لوگ جو نوکریوں کی تلاش اور سفارشوں کے شکار ہیں اپنے افسروں کی قدمبوسی حاصل کرنا چاہیں ان کے لئے اس بات کا علم ضروری ہے کہ صاحب کس وقت شیو کرتے ہیں۔

ڈاڑھی کی کھونٹیاں کھیت میں جوار کی کھونٹیوں کی طرح تکلیف دہ ہوتی ہیں۔ نیکار کے شائقین اس میں ٹھوکریں کھا کھا کر پریشان ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح گال کی کھونٹیاں نہ صرف ہاتھوں کو تکلیف دیتی رہتی ہیں بلکہ دماغ پر افسردگی اور جسم میں سنسنی بھی پیدا کر دیتی ہیں۔ بعض اوقات شرارت کی تحریک بھی پیش کرتی ہیں ایسی صورت میں گھر کے ننھے۔ بھولے اور معصوم بچوں اور نیک بیویوں کے نرم گال تختہ مشق بنائے جاتے ہیں۔ گرمی کے زمانے میں جس وقت ہر بن مو سے پسینہ کی تلیاں بہ رہی ہوں آپ کسی نرم جلد پر اپنی ڈاڑھی کا برش پھیر کر دیکھ لیجئے ایک چیخ آسمان اور ایک چیخ زمین نہ ہو تو میرا دمہ۔

اس کا سائنٹفک پہلو پیش کرنے کے لئے مجھ کو تھوڑی تہید اٹھانا پڑیگی اور وہ یہی کہ انسان کے جسم پر بال کس لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ آپ کو یہ قسylim کرنا پڑیگا کہ موجودہ انسان بحیثیت مجموعی حیوانات کی ارتقائی صورت کا نتیجہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ نسبتاً زیادہ مذہب، حساس اور ذکی الحس واقع ہوا ہے اسی ارتقاء

دماغ کے شانہ بشانہ بالوں کی پیداوار میں انخطاط واقع ہو رہا ہے۔ پست درجہ کے جاندار بالدار ہوتے ہیں تاکہ وہ موسم کی ستم ظریفیوں سے محفوظ رہ سکیں۔ گردوغبار کے ماحول میں پرورش پانا گویا بالوں کو دعوت نمودینا ہے۔ اس کے برخلاف مروجہ زمانہ کا مہذب انسان بلاناغہ غسل کرتا ہے اور اپنے خون کا معتد بہ حصہ دماغی نشوونما میں صرف کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فضلہ کم تعداد میں پیدا ہوتا ہے اور جلد کے بالوں کی پیداوار میں تیزی ناپید ہو جاتی ہے۔ ایک زمانہ البتہ ایسا تھا جس میں انسان اپنے سے کمزور پر خوف و جلال طاری کر کے حکومت کرتا تھا۔ اسی لئے فیملی میں ریشائیل بزرگ سے عورتیں اور بچے بھی خائف رہتے تھے۔ کج کالج خوف کے بجائے الفت و محبت نے لے لی ہے اس لئے اس ہتھیار کی چند ضرورت نہیں رہی شیوکے اس مسلسل عمل سے ممکن ہے کہ بالوں کی نمو مفقود ہو جائے اس مقام پر ایک اعتراض کیا جاسکتا ہے اور وہ یہ کہ مرد کے بال جسم کے اندرونی غدودوں کے سیال ہات سے قوت نمو حاصل کرتے ہیں۔ فی الحال میں اس کو رد نہیں کر سکتا۔ ممکن ہے کہ آئندہ زمانے میں یہ نظریہ بھی کشش ثقل کے مسئلہ کی طرح غلط ثابت ہو جائے۔ بہر حال مردوں کا عورتوں کی طرح داڑھی اور موچھوں سے آزاد ہونا طریفین میں محبت کی بنیاد کو استوار کرتا ہے اور اس لئے ایک عمل صالح ہے اور آرٹ کی تقلید میں سعی لطیف۔

فی زمانہ شیوکرو اور شیوکرنے دو سوسائٹی کا ایک نہایت اہم اعلان جس کی

اطاعت ہم پر ضروری ہے۔ خصوصیت کے ساتھ ذیل کے لوگوں پر۔

(۱) جن کے بال روس کی آبادی کی طرح ایک عدد فی مربع میل ہوں۔

(۲) جن کے گال بالوں سے فطری طور پر مستغنی ہوں۔

(۳) جو سسرال میں دکھوا جانے والے ہوں۔ یا سرکاری ملازمت کے امیدوار ہوں۔

(۴) جن کی داڑھی کے بال تجربہ کار ہو چکے ہوں۔

وہ حضرات جو اس سے متفق نہیں نہ صرف سوسائٹی کے احکامات کو پس پشت ڈالتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ ہی فطرت کے حکم سے بھی شان استغنا برتتے ہیں کی رٹ کی گردن پر چھری پھیرتے ہیں اور جنس لطیف پر ظلم۔ ایسے لوگوں کا تجزیہ حسب ذیل طریقوں سے کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ "غربت"۔ شیو کرنے کا سامان خریدنا یا جھلم کی اجرت دینا امکان میں نہیں۔

۲۔ "کاہلی"۔ زحمت سے بچنا چاہتے ہیں اس لئے عید کی رات ہی کو غسل کرتے ہیں

۳۔ "سیاست"۔ خادم کعبہ یا مولانا کا خطاب حاصل کرنے کے لئے یہ پالیسی

اختیار کی جاتی ہے۔ عبا۔ قبا، جبہ و دستار کی پوشش کے ساتھ داڑھی لکھی نہیں جاتی بلکہ پہنی جاتی ہے لباس کی طرح اور ٹسکانی جاتی ہے سیج کی طرح۔

۴۔ "جمالت"۔ تنگ نظری، تعصب، ضد اور جمالت کا پردہ آنکھوں پر

پڑا رہتا ہے اور چہرے پر نمایاں، زندگی کی لطافتیں خود پر حرام کر لیتے ہیں اور دوسروں پر ریند۔ علی گٹھ کی فضا میں آنکھ کھلتی ہے اور یہ خود رو پھینچو ہندی دور۔ وگرنہ آستانہ

عروس پر منہ دکھائی کے وقت اس کا چڑھاوا چڑھانا ہی پڑتا ہے۔

۵۔ ”چہرہ کشی“ خود کشی کا دوسرا نام ہے۔ جو نوجوان دنیا کی ستم ظریفیوں سے تنگ آجاتے ہیں اور زندگی سے بیزار وہ خود کشی پر آمادہ ہو جاتے ہیں لیکن جب دیکھتے ہیں کہ ہمت مفقود ہے تو دارھی رکھ لیتے ہیں۔ گویا اس طرح وہ دارھی کی نقاب ڈال کر دنیا سے روپوش ہو جاتے ہیں اور اس کی سرتوں سے محروم،

۶۔ ”پیری“ جب قوا مضحل ہو جاتے ہیں اور عناصر میں اعتدال باقی نہیں رہتا تو گوشہ نشینی کے ساتھ جہاں دوسری لذتوں سے کنارہ کشی کی جاتی ہے وہیں شیوہ بھی دست برداری کرنا پڑتی ہے۔ اس لئے مجبوری ہے اور قابل معافی۔

۷۔ ”اتقا“ ایسے بزرگ جو خالصاً لوجہ اللہ دارھی رکھتے ہیں اور خدا کی اس نعمت پر سجدہ ریز ہوتے ہیں یقیناً قابل احترام ہیں۔ اس مضمون میں ہمارا رولے سخن ان کی طرف اللہ باللہ نہیں ہے۔

۲

نا انصافی ہوگی اگر دارھی کے ضمن میں موچھوں کا تذکرہ نہ کیا جائے۔ ان لوگوں کی ذہنیت پر مجھ کو بچہ افسوس ہوتا ہے جو باوجود اس کے کہ دارھی کو مبہم کر جاتے ہیں لیکن اس کی دم کو موچھوں کی شکل میں باقی رکھ کر مردانگی کا دعویٰ کیا کرتے ہیں اور ان پر خاص طور سے استہزاء کرتے ہیں جو اس ادھورے کام کو پایہ تکمیل تک پہنچا دیتے ہیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ان دونوں کا چولی داہن کا ساتھ ہے

رہیں تو دونوں باقی رہیں وگرنہ ایک بھی نہ رہے۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ایک کی غیر موجودگی میں دوسری سوگوار نظر آتی ہیں، بہتر ہو کہ وہ ایک قدم اور آگے بڑھیں اور آئندہ سے صرف ایک کلتے کا شیوہ کیا کریں اور دوسرے کلتے پر ڈاڑھی اُگا لیں۔

طبی نقطہ نظر سے ہم یہاں تک کہنے کے لئے تیار ہیں کہ موچیں پسندیدہ ڈاڑھی کے زیادہ خطرناک ہیں۔ انہرمن لشمس ہے کہ

(۱) ان کے بالوں کے جراثیم اشیا خورد و نوش کو نہ ہر بلا بنتے رہتے ہیں۔

(۲) ننھوں پر اس طرح چھا جاتے ہیں کہ پردہ معلوم ہونے لگتا ہے جس کی وجہ سے ہوا کی آمد و رفت میں دقت محسوس ہوتی ہے۔

(۳) ہونٹ جیسے لطیف عضو پر بے جاد یا وڈال کر گفتگو کی روانی میں خلل ہوتے ہیں۔ یہی وجوہات ہیں کہ موچیں بذات خود شائع کی گئی ہوں میں بھی کھٹک گئیں اور ان کی صفائی مستحب قرار دیدی گئی اور ڈاڑھی کی حرام،

کیا ریاضی کے اس معمولی مقالے سے معترضین کو اتنی بھی واقفیت نہیں کہ موچوں کی صفائی ڈاڑھی منڈوانے کے گناہ کو ہلکا کر دیتی ہے۔

البتہ جو لوگ موچوں کو پریشان کر کے مختلف اصلا میں مل لاتے رہتے ہیں وہ کسی حد تک قابل الزام ہیں لیکن اذروئے انصاف وہ بھی بری الذمہ قرار دیئے جاسکتے ہیں کیونکہ وہ بذات خود اس کے ذمہ دار نہیں بلکہ استرہ مورد الزام ہے۔ کیا آپ کو اس بندر کی کہانی یاد نہیں جو بیلیوں کی روٹی کو ترازو کے دونوں

میں رکھ کر انصاف کرنے بیٹھا تھا اور ان کو مساوی رکھنے میں ناکام رہ کر سب بھٹم کر گیا تھا۔ بعینہ ہی حادثہ ہمارے چند دوستوں کو بھی پیش آتا ہے۔ ہاتھ ہی تو ہے جو بلا ارادہ حرکت کر جاتا ہے اور دونوں طرف کی مونچھوں کو مساوی الا ضلع مثلث بنانے میں اکثر اوقات کامیاب نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ ایک طرف کتر، بیونت کی جلے تو دوسری طرف بھی انصافا وہی عمل دہرا پاڑتا ہے تا انیکہ مجبوراً بنائے فساد کا خاتمہ ہی کرنا پڑتا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے خوبصورت چہرے کو سینا کا مزاحیہ سین بنا دیں؟

پوچھ لیجئے کسی ایسے نو دار دے جو موچہ منڈا کر نہ پھڑوں میں داخل ہوا ہو۔

۳

دنیا میں دو چیزیں جس قدر پرانی ہوتی جاتی ہیں اسی قدر عزیز تر ہوتی جاتی ہیں

(۱) بے کاری

(۲) اُسترہ

یہی وجہ ہے کہ میرے اکثر دوست اور مہمان مجھ سے محض اس بات پر ناراض ہو جاتے ہیں کہ میں ان کی خاطر تواضع اپنے اُسترے سے نہیں کرتا حالانکہ ان کے قدموں کے لئے مجسم قالین بن جاتا ہوں۔ بزرگوں کا قول ہے کہ اُسترہ اور گھوڑا دو جانور ہیں جو وفاداری اور شرافت میں ایک دوسرے کے ہم پلہ ہیں اور نزاکت طبع میں ایک دوسرے سے بڑھے چڑھے ہوئے۔ ان کی مزاج شناسی گھیل نہیں ہے

بدیں وجہ غیر کی ران کے پیچھے گھوڑا بالکل ٹوہن جاتا ہے اور دوسرے کے ہاتھیں
استرہ گھاس کاٹنے کی کھڑپی۔ رواں استرہ کمر بانی قوت رکھتا ہے جس کے سامنے شعر
کی گرمی اور پانی کی روانی کوئی وقعت نہیں رکھتی۔

میں نے استرے کے لئے جانور کا لفظ استعمال کیا ہے اور صحیح استعمال کیا
ہے۔ ہر وہ چیز جو جان اور حیات کی مالک ہو جانور کہلائی جاسکتی ہے۔ علم حیات
کے مشہور پروفیسر سر جیکبش چندربوس نے حال ہی میں یہ ثابت کیا ہے کہ حیاتیات
کے شعبہ میں نہ صرف حیوانات و نباتات شامل ہیں بلکہ ان میں جمادات بھی
شامل ہیں۔ کوئلہ۔ پتھر اور لوہا وغیرہ جمادات میں شمار کئے جاتے ہیں۔ بظاہر
اس جہت سے کہ وہ ساکن ہیں اور جامد لیکن ارباب بصیرت کی نظروں میں وہ
متحرک ہیں اور حساس۔ مثلاً استرے ہی کو لے لیجئے کہ بعض اوقات وہ بلا
کسی ظاہری سبب کے چلتے چلتے گند ہو جاتا ہے۔ بعینہ اسی طرح جس طرح
ایک مضمون نگار کا دماغ۔ اس خاص موقع پر لوہے کے استرے کو اور مضمون نگار کے
دماغ کو لاکھ سلی پررگڑیں اور اڈیٹر کے سالنامے سے خوف دلائیں مگر وہ دونوں
ٹس سے مس نہ ہونگے ان کا واحد علاج یہی ہے کہ انہیں آرام کرنے دیا جائے
تاکہ ان کے کمر بانی ذرات اسی ترکیب سے ترتیب پا جائیں کہ صورت سابقہ پر آجائیں
گویا استرہ بھی مضمون نگار کے دماغ کی طرح تھک جاتا ہے آرام لیتا ہے۔ سوتا ہے
بیدار ہوتا ہے اور پھر حسیت و چالاک ہو کر مشین بن جاتا ہے۔

اس ٹھوس سائنٹفک ثبوت کے بعد استرے کے ذی حیات ہونے میں اگر کچھ شک باقی رہ گیا ہو تو ہمارے استرے کے عادات و اطوار کا معاینہ اس کو رفع کرنے میں کامیاب ثابت ہوگا اس کی چند خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں۔
(۱) مجھ سے بے انتہا موانست کی وجہ سے وہ غیر کے ہاتھ میں جا کر اس قدر اراض ہوتا ہے کہ گالوں کو کاٹ کھاتا ہے۔

(۲) میری طرح وہ بھی وقت کا بے انتہا پابند ہے حسب دستور صبح کے اٹھ بجے تیز اور رواں رہتا ہے۔ گردن کے دوسرے اوقات میں رات کے جاگے ہوئے چوکیدار کی طرح نیم خواب،

(۳) اتوار کے دن پوری تعطیل مناتا ہے کیونکہ میں خود دن کے بارہ بجے بیدار ہوتا ہوں اور بقیہ دن گھر کے اندر ہی گزارتا ہوں۔

(۴) نزاکت طبع میں بھی وہ میرا ہم پلہ ہے موسمی تغیرات سے بہت جلد متاثر ہوتا ہے۔ خصوصاً برسات میں مرطوب ہوا موافق نہیں آتی۔ چہرہ مکر ہو جاتا ہے اور سوزہ منہم کی شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔

اب آپ ہی انصاف فرمائیے کہ ایسا مزاج شناس استرہ مجھ کو کس قدر عزیز ہوگا مگر افسوس کا مقام ہے کہ اس کی یہ خصوصیات اس مضمون کی تحریر کے چند ماہ قبل تک تھیں مگر اب صورت حالات بدل چکی ہے۔ یہ ولایتی اہل اپنی اہل پر گیا اور مہندوستان کی عیش افزا آب و ہوا سے متاثر ہو کر

تیز ہتھیار کی تلاش کرنا بیسود کیونکہ اچھا استرہ قسمت سے ملتا ہے حکمت سے نہیں۔
 اسی زمانہ میں حسن اتفاق سے مجھے بمبئی کی سائنس کانگریس میں جانے کا اتفاق
 ہوا جہاں میرے دیرینہ کرمفرما....! یونیورسٹی کے فاضل پروفیسر حیات ڈاکٹر
 سے شرف ملاقات حاصل ہوا۔ میں نے ان کی خدمت میں اپنا استرہ پیش
 کرتے ہوئے اس کے حالات بے کم و کاست بیان کر دیے چونکہ یہ کیس لفظ ہر کچھ
 معلوم ہوتا تھا اس لئے پروفیسر مذکور نے کانگریس کی ایک نشست میں اس
 اہم مسئلہ کو بھی پیش کر دیا۔ فاضل پروفیسروں نے جن میں ڈاکٹر.... ڈی۔ ایس
 سی، ایس، سی، ڈی آف.... یونیورسٹی اور ڈاکٹر.... آف....
 یونیورسٹی جیسی ہستیاں تھیں مجھ کو طلب کیا اور مختلف سوالات کرنے کے
 بعد استرے کو مختلف تجارت کے لئے تجارت گاہ روانہ کر دیا۔ وہاں سے تقریباً ایک
 ہفتہ کے بعد سکریٹری نے مجھے تار کے ذریعہ سے طلب کیا اور یہ رپورٹ پڑھ
 کر سانی جس کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے۔

”ابو طاہر صاحب کے استرے نے دنیائے سائنس میں ایک نہ کہ ڈال دیا ہے
 اور ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ عرصہ قریب میں علم
 حیات پر تمام لٹریچر کو از سر نو مرتب کرنا پڑیگا اور استروں کے معائنہ اور تجربہ کے
 لئے ایک نیا محکمہ قائم کرنا پڑیگا۔ جس میں داخلہ کے وقت اصلاح خانوں کے
 ڈاکٹر کٹروں کو خاص طور سے مراعات دی جائیں گی۔“

بحوالہ نظریہ سرکلکیش چندربوس زیر غور استرہ مکمل حیات کا مالک ہے اور اپنے ارتقائی مدارج کو بسرعت تمام طے کر رہا ہے۔ ڈارون کا وہ نظریہ ارتقاء جس کو موجودہ زمانہ میں غلط ثابت کیا جا رہا تھا از سر نو زندہ ہو گیا اور اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ موجودہ انسان نتیجہ ہے بندروں کے ارتقاء کا۔ نہ صرف یہ بلکہ اس پیچیدہ مسئلہ کا حل بھی دریافت ہو گیا ہے جس کی رو سے مخالفین کے لئے راہِ فرار سد ہو گئی ہے۔ اسٹریا کے مشہور پروفیسر ڈی ویریز نے ایک بار نظریہ کمیشن کی رو سے یہ ثابت کیا تھا کہ بہت سے ذی حیات اجسام ارتقائی مدارج کے برخلاف اپنی صورت یکبارگی تبدیل کر لیتے ہیں۔ اس استرے کے معاینہ کے بعد اس نظریہ کا ثبوت بھی پایہ تکمیل کو پہنچ گیا ہے کیونکہ مستقبل قریب میں ہم امید کرتے ہیں کہ اس استرے کا جسم اپنے موجودہ ہوبلی کو تبدیل کر کے یکبارگی حیوانی صورت اختیار کر لے گا اور دنیائے حیات میں ایک نئی قسم کے جانور کا اضافہ کریگا۔ فی الحال اس کے عادات و خصائص اور شکل و صورت پر بحث ناممکن ہے۔ البتہ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ یہ گوشت پوست سے مرکب لوہے سے ملتا جلتا ایک پرنڈ ہوگا۔ بالکل اسی طرح جس طرح ایک تتلی ہوتی ہے درخت کے سوکھے ہوئے پتے کی شکل کی۔ اپنے ماحول کے زیر اثر یہ بالوں کی خوراک ہی پر اپنی زندگی بسر کریگا اور اس کا مقصد حیات رخساروں کے لالہ زار لہلہاتے ہوئے کھیتوں کی صفائی ہوگا۔ اس کی نسل بہت تیزی سے پھیلے گی اور ایک عرصے کے بعد

مڈیوں کے دل بادل کی طرح ان کا جتھا بالوں کے کھبت کے لئے ایک مستقل خطرہ بن جائیگا۔ ممکن ہے کہ اس زمانہ میں سر کے بال ٹوپی سے محفوظ رہیں تو نہیں۔ مگر نہ دائرہ اور موچھوں کے بال ناپید ہو جائیں گے۔ البتہ مولولیوں، پادریوں اور دوسرے بزرگوں کے لئے سخت مشکل کا سامنا ہوگا۔ ممکن ہے کہ ان کی صدائے احتجاج پر کتے اور دوسرے جانوروں کی طرح اس جانور کے ازدیاد نسل پر بھی گورنمنٹ کی طرف سے کچھ پابندیاں عاید کر دی جائیں۔

ایسی حیرت انگیز تبدیلی کی مدت تقریباً چار پانچ سال ہوگی۔ اس عجیب و غریب آلہ کے کند ہونے کا سبب معلوم کرنے کے ضمن میں ہم پر ایک دوسرے حیرت انگیز واقعہ کا انکشاف ہوا اور وہ یہ کہ اس میں جنسی خصوصیات بھی بنانا کی طرح بدرجہ اتم موجود ہیں۔ دراصل زیر غور استرہ مذکر نہیں ہے بلکہ مونث ہے۔ تعجب ہے کہ چھ سال کی مدت میں اس نے اپنی افزائش نسل میں کوشش نہیں کی۔ اس کے خوش قسمت مالک کے بیان پر معلوم ہوا کہ اتفاقاً یہ استرہ تنہا ہی رکھا یا رکھی گئی۔ اگر حجب ام کی کسوت میں ہوتا تو مذکر استروں کے انصال سے ضرور کچھ نہ کچھ نتیجہ برآمد ہوتا۔

ڈاکٹر ہنتا کا بیان ہے کہ اس استرے کے کند ہونے کا سبب سوائے اس کے اور کچھ جو ہی نہیں سکتا کہ یہ حاملہ ہو چکا ہے۔ ان کے پاس اس کے باور کرنے کے لئے بہت سے ثبوت ہیں۔ لیکن دقت یہ ہے کہ ہم اس موجودہ حالت میں

اس پر کسی قسم کا کیمیاوی عمل نہیں کر سکتے کیونکہ ایسی صورت میں اس کے ہلاک ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اگر ہم اس بیان کو صحیح مان بھی لیں تو بھی ہم کو اتنا راجل کے لئے کوئی دوسرا سبب تلاش کرنا پڑیگا کیونکہ اس کے مالک کے بیان پر یقین کرتے ہوئے ہم اس کا جنس مخالف سے اتصال ثابت ہی نہیں کر سکتے۔ اس مقام پر ڈاکٹر رفیق نے جو خیال ظاہر کیا ہے وہ بھی دلچسپ ہے اور قرین قیاس وہ اس امر پر زور دیتے ہیں کہ طرفین میں رشتہ قائم کرنے کی محرک کوئی دوسری شے ہو ہی نہیں سکتی مگر پتھر کی سلی۔ کیونکہ یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ پھولوں میں مادہ حیات کا تبادلہ جسمانی اتصال سے معرض وجود میں نہیں آتا بلکہ اکثر اس تحریک کی موجب ہوا، پانی اور شہد کی مکھیاں ہوتی ہیں۔ اسی طرح ایک ہی سلی پر مختلف قسم کے استروں کا اتصال بھی مذکورہ نتیجہ کا سبب بن سکتا ہے۔ بہر حال اگر یہ امر واقعہ ہے تو اس کے نتائج کے لئے تقریباً ایک سال تک انتظار کرنا پڑیگا۔ ہم اس کے خوش قسمت مالک سے اس حیرت انگیز نمونے کو دینے کے فائدے کے لئے طلب کرتے لیکن وقت یہ ہے کہ اگر اس سے حسب معمول شیوہ کام لینا بند کر دیا جائیگا تو یقیناً جس طرح دوران خون بند ہو جاتا ہے اسی طرح اس کے ذرات کی حرکت بھی بند ہو جائیگی اور ایسے نازک موقع پر اس کی تذکرہ بالا تبدیلیوں پر بھی اثر پڑیگا۔ ممکن ہے کہ بالوں کی خوراک نہ ملنے سے یا بالوں کی رگوں سے کربائی قوت نہ حاصل ہونے سے جامد بن جائے۔

بہر حال اس ایک شہادت سے زنجیر ارتقاء کی تمام کھوئی ہوئی کڑیوں کا سلسلہ مل چکا ہے اس لئے ہم بیا ننگ دہل اعلان کرتے ہیں کہ -

(۱) مادہ کی تقسیم باعتبار جمادات، نباتات اور حیوانات غیر فطری ہے۔

(۲) نظریہ ارتقاء کی رو سے حیوانات نتیجہ ہیں نباتات اور جمادات کی تدریجی یا یکجا رگی ترقی کا۔

(۳) ذی حیات اور مردہ اجسام میں بھی کوئی فرق نہیں۔ اول الذکر نتیجہ ہے ذرات کی حرکت کا اور آخر الذکر سکون کا۔

ان حیرت انگیز الحشانات پر میں سراپا حیرت و استعجاب بن گیا۔ مجھ کو اس خیال سے بھی سرت ہوئی کہ جس طرح آئین سائین نے نظریہ اصناف سے دینائے سائنس میں تسکیم ڈال دیا تھا میں بھی اس یہودی پروفیسر سے کسی طرح کم ثابت نہ ہونگا۔ لیکن جس وقت مجھے اپنے نامکمل شیو کا اور اس کے مابعد اثرات کا خیال آیا تو میں سجد طول ہوا اور میں نے ارادہ کر لیا کہ زندہ جاوید ہستی بننے سے ہزار درجہ یہی بہتر ہے کہ خود میں دنیا میں گنہگار ہوں مگر اس طرح کہ بال میں سے چھڑے یہ گنہگار نہیں۔

اسی نقطہ نظر سے میں نے کمیٹی کے سامنے اپنی داڑھی کی بیکسی اور کس مپرسی کی داستان بیان کرتے ہوئے سر جوبی (علم جراحی) کے ماہر ڈاکٹر بھاٹیہ سے غاص طور پر استہدائی کہ اس آلم میں ولایتی عورتوں کی طرح "منبط تولید" کا مادہ پیدا کر دیا جائے

تاکہ اس میں سابقہ تیزی دوبارہ عود کر آئے۔ ڈاکٹروں نے متفق ہو کر میری اس درخواست کو ٹھکرا دیا کیونکہ وہ ضبط تولید کے محض اس وجہ سے مخالف تھے کہ اس فطری مادہ کو روک دینے سے عورتوں کا جسم اپنی قدرتی حدوں سے تجاوز کرنے لگتا ہے یہاں تک کہ وہ گوشت کا ایک پھاڑ بن جاتی ہیں۔ اسی طرح ان کے خیال میں استرا بھی طویل و عریض ہونے لگتا۔ یہاں تک کہ تلوار دست پناہ یا تو ابن جانا میں نے آخری بار ایک اور انتخاب کی اور وہ یہ تھی کہ یورپ کے تبدیل جنسی کے کسی ماہر ڈاکٹر سے کیوں نہ اس آلہ کو مونث سے مذکر بنوا دیا جائے تاکہ اس کے فرائض کی ادائیگی میں خلل واقع نہ ہو۔ میں نے اس امر پر افسوس کیا کہ اگر مجھ کو ان تمام انکشافات کا اس سے قبل علم ہوتا تو میں سلی کو استعمال کرنے سے قبل جراثیم مارنے والی دوا سے دھو لیا کرتا تاکہ ہسپتال کی نرس کی طرح میرا استرہ ایک سال میں چند ماہ کے لئے معطل نہ ہو جاتا۔ ڈاکٹروں نے اس کی بھی مخالفت کی اور مجھ کو مشورہ دیا کہ لقیہ مدت بہت احتیاط سے گزاروں اور اس استرے سے شیوے کے عمل کو جاری رکھوں دُرنہ دنیا بے سانس میری خود پرستی اور خود غرضی کی وجہ سے ایک نادر الوجود شے اور ایک مکمل ثبوت سے محروم ہو جائے گی۔ آخر میں انھوں نے مجھے ان تمام واقعات کے پوشیدہ اور مخفی رکھنے کی تاکید فرمائی کیونکہ اندیشہ تھا کہ یہ بال خورہ جسے داڑھی کا بمب بھی کہہ سکتے ہیں ریش درازوں کی نگاہوں میں کھٹکے اور قبل از وقت برباد کر دیا جائے۔

بہر حال میرے استرے کی مذکورہ بالا کیفیت دینائے سائنس کے لئے اہم افزا
تھی مگر میرے لئے یابوس کن۔ میں شیو کرتا رہا لیکن وہ روحانی مسرت نہ حاصل ہوئی
جو اس سے قبل ہوتی تھی۔ میری طبیعت افسردہ، ملول اور پریشان رہنے لگی
جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں بیمار پڑ گیا۔ ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ ٹیبلٹ
اور میرا اعتقاد تھا کہ دائرہ کے جراثیم۔

ہم ایک ماہ کا مل بیمار رہے۔ ایسی صورت میں مرض کے جراثیم کے ساتھ ساتھ
دائرہ کے جراثیم بھی پرورش پاتے رہے۔ آخر کار جب صحت ہوئی تو ہمارے چہرے
پر خود رو دائرہ کی ایک پھل پھلائی ہوئی فصل تیار تھی جو بقول حضرت سعدیؒ
گندنا کی کھیتی کی طرح تھی اور ہم باوجود صحت پانے کے خزاں رسیہ پتوں کی
طرح زرد۔۔۔ استرے کے متعلق اگر آپ دریافت فرمائیں تو بصدافسوس
اتنا عرض کر سکتا ہوں کہ اس کو جب میں نے خلتے سے نکالا ہے تو وہ ایک رنگ
خوردہ اور دیمک لگا ہوا الو ہے کا کمر اٹھا۔ دنیائے سائنس اس موضوع پر
واقعہ پر جس قدر بھی تاہم کرے کہ ہے۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ فطرت نے چند اہل قوانین بنائے ہیں جو وقت معینہ پر مختلف
تحریکوں کے ماتحت انسان کے مختلف فرائض کی انجام دہی کے محرک ہوتے ہیں
ایسے عمل کیلئے کسی بیرونی تحریک کی کوئی ضرورت لاحق نہیں ہوتی مثلاً حاج ضروری

ہمارا یہ فعل دراصل نتیجہ تھا بیرونی تاثرات کا اس لئے ہم کو قدرت نے اس غیر فطری عمل کے سرزد ہونے پر سزا دی۔ جس کی داستان ذیل میں بیان کی جاتی ہے۔

(۱) لیبر یا سہ صحت ہونے کے باوجود ہمارے خون کا معتد بہ جھٹہ دارھی کی پرورش و پرداخت میں صرف ہو رہا ہے اس لئے ہم بسرعت تمام کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔ مولویوں کی طرح دارھی لمبی ہو رہی ہے اور دل خشک طبیعت کی سنگتگی اور زندہ دلی مفقود ہو رہی ہے۔ جذبہ غضب ترقی کر رہا ہے۔ جذبات اور حسیات میں تبدیلی پیدا ہو رہی ہے۔ دل مجبور کر رہا ہے یا تو دعویٰ نمیری کر دوں یا صوفی بن جاؤں۔ ہاتھوں کی پشت پر ایک لطیف غلش سی محسوس ہوتی ہے جو اس وقت دور ہو جاتی ہے جبکہ کوئی عقیقہ نند بلا استثنائے جنسیت ان کو اپنے لبوں سے مس کرتا ہے۔

(۲) ٹھوڑی اور گالوں کی غلش بھی بے انتہا تکلیف دے رہی ہے۔ ریت کاغذ سے کھرچنے کا ارادہ ہے میرا سیدھا ہاتھ ہمیشہ دارھی سے الجھا رہتا ہے۔

(۳) بیگم سے جنگ چھڑ گئی ہے کیونکہ ان کو میری نسبت بہت سے شکوک پیدا ہو گئے ہیں۔ جذبہ انتقام مجبور کرتا ہے کہ وسعت حرم و وسیع تربتاؤں۔

(۴) میرے قرض خواہوں نے نوٹس دیدیا ہے کہ میں ایک ماہ کی مدت میں تمام سابقہ تسکات، دستاویزات، اقرارنامہ جات اور قرضہ جات کو

چکا دوں کیونکہ اب میں ان کی نظروں میں خطرناک قسم کا انسان ہو گیا ہوں
کیا میں اعلان کردوں کہ یہ تحریریں جعلی ہیں۔

(۵) میرے خاندان کے بہت سے بچے جب رونے لگتے ہیں تو انہیں میری
زیارت کرائی جاتی ہے جس پر وہ گھبرا کر آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ یہ وبا محلے تک
پھیل گئی ہے۔ ایک عرصے کے بعد میرے مکان پر رونے والے بچوں کی
ایک نمائش گاہ قائم ہو جائیگی۔

(۶) مجھ کو ولانا کا خطاب عطا ہونے والا ہے لیکن تاہنوز گزٹ نہیں ہوا۔
فی الحال میں داڑھی کی قربان گاہ پر اپنے تمام حقوق قربان کرنے کو تیار ہوں
لیکن خدا کے لئے مجھ کو بتائیے کہ میں اس آخری مصیبت پر کس طرح صبر کروں۔
بھائی ملازموزی صاحب واقعی قابل تعریف ہیں کہ ملا اور مولانا کا جزو اپنے
نام کے ساتھ استعمال کرتے ہیں لیکن میں ان کی تقلید کسی طرح نہیں کر سکتا
جس طرح ان کو منشی کے نام سے عداوت اور بغض للہی ہے۔ اسی طرح مجھ کو
مولانا کے نام سے کیونکہ اول الذکر اس شخص سے منسوب کیا جاتا ہے جس کو
موت ہو نہ رزق۔ آخر الذکر اس شخص سے جس کے دماغ میں شے لطیف کی کمی
ہو۔ خدا خواستہ اس سے میرا مقصد اس خاص لفظ کی تحقیر کرنا نہ نظر نہیں
بلکہ مجھ کو اختلاف ہے اس کے غلط اور بے محل استعمال پر، عامۃ الناس نے
اس مبارک لفظ کو ہر اس شخص کے متعلق استعمال کرنا شروع کر دیا ہے

جس کے پاس سوائے داڑھی کے سر ٹینکٹ کے دوسری قابلیتیں مفقود ہوں خداوند
محفوظ رکھ تو مجھ کو دوستوں کی اس فتنہ انگیزی سے وگرنہ داڑھی سے۔

اگر میرے ناظرین میں کوئی محترم کونسل کے ممبر ہوں تو میں ان سے بعد ادب
عرض کروں گا کہ خدا کے واسطے اس متبرک خطاب کو شمس العلماء کے خطاب کی طرح
بجی گوئی نہ محفوظ کر دیجئے تاکہ اس سے ہر کسف ناکس مستفید نہ ہو سکے۔

دوسری عرض یہ ہے کہ ایک میڈیکل بورڈ کے قیام پر غور کیا جائے جو تحقیقات
کے لیے کہ موجودہ زمانہ کی آب ہوا میں دماغی نشوونما پر داڑھی کا کس حد تک
اثر ہوتا ہے۔

آخر میں اس دعا پر اپنے مضمون کو ختم کرتا ہوں کہ میری طرح آپ کو بھی اڑھی
رکھنے کی توفیق ہو تاکہ ہماری برادری میں دن دونی رات چوگنی تہتی ہو۔
”زندہ باد داڑھی!“

(نیزنگ خیال)

ندامت

مسلم کلب پونا میں برج کی نیز کے چاروں طرف بیٹھے ہوئے ہم لوگ لائٹ آف ایشیا کے لمبے کش کھینچ رہے تھے۔ واحدی صاحب بولے کہ ”بھئی میرے اوپر کج ایک عجیب واقعہ گذرا۔“ میں نے کہا ”خیر تو ہے؟“ بولے کچھ نہیں ہے تو معمولی سا مگر اب تک ندامت کی وجہ سے پسینہ میں تر ہوں۔ کل میرے بھائی کی شادی تھی آپ تو گئے تھے اتارنے رات کو عجیب لہجہ میں وہ دلاری والی چیز تالی بجایا کر گائی تھی مجھ کو بہت پسند آئی۔ ”چھوٹے نہ دیے جو بنا۔“ ہر ہنٹ پر میں اس کو دہراتا تھا۔ آج دو بجے تمام رات اور دن کھڑے کھڑے تھک گیا تھا۔ ذرا لیٹ رہا آدمی آیا کہ سیٹھ صاحب بلاتے ہیں جا کر دیکھا تو والد صاحب کے پاس آٹھ دس آدمی بیٹھے ہیں۔ مجھ سے بولے کہ ”دیکھو احمد بھائی کریم سیٹھ سے ملو۔ آپ کل شادی میں شریک نہ ہو سکے کج کراچی سے آئے ہیں۔ انھیں کی لڑکی سے میری شادی ٹھیری تھی۔ آج پہلی دفعہ میں نے دیکھا۔ دو چار باتیں مجھ سے کر کے وہ پھر والد سے گفتگو کرنے لگے۔ میں اٹھ گیا۔ والد نے آنکھ کے اشارے سے ٹھہرنے کو کہا۔ میں علیحدہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ سب بدھے تھے اور خوب باتیں کر رہے تھے کچھ والد کا ادب کچھ

ان کے والد سے جھجک سب کا منہ دیکھتا رہا اور خاموش بیٹھا رہا۔ باتیں ختم ہی نہیں ہوئی تھیں، اسی اثنا میں مجھے ”چھوئے نہ دیے جو بنا“ یاد آگیا۔ اس کو دل ہی دل میں کہتا تھا۔ ہاتھ پر ہاتھ مارتا تھا اور لطف اٹھاتا تھا۔ میرے سامنے کوئی نہ تھا۔ میں تھا اور چھوئے نہ دیے جو بنا۔ یکا یک ہاتھ آہستہ آہستہ سے تڑتی کر کے اور زیادہ بلند ہوئے ”چھوئے نہ دیے جو بنا“۔ دل ہی دل سے زبان پر بھی آیا۔ اور اب میں نے یکبارگی پورے زور سے تالی بجائی اور چھوئے نہ دیے جو بنا چھوئے نہ دیے جو... ب... نا“ تال اور دم کے ساتھ کہنے لگا۔

”بدتمیز کی آواز تھی یا کوئی توپ کا گولہ تھا۔ تھرا اٹھا۔ اب آنکھیں کھلیں تو دیکھا کہ سب میری طرف دیکھ رہے ہیں اور کچھ لوگ منہ پر رومال رکھے منہس بھی رہے ہیں۔ والد غصہ سے سرخ ہیں اور نئے بیٹھ صاحب میری طرف حقارت سے دیکھ رہے ہیں۔ پسینہ آگیا۔ اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی تنچے۔ لا حول و لا قوۃ۔ یہ مجھے کیا ہو گیا۔ سوائے اس کے کہ بے تحاشا کرسی چھوڑ کر دروازے کی طرف لپکا۔ اتنا بھی خیال نہ رہا کہ سامنے حقہ ہے۔ ٹھوکر لگی۔ حقہ گرا چلم لوٹی۔ آگ بجھری مگر میں کو دیکھنا نہ کر بجا وہ جا۔ اس وقت سے اب تک اپنے کمرے میں چھپا بیٹھا رہا اب بولو والد سے کیسے آنکھیں چار ہو گئی؟

سب خوب دل کھول کر منہ سے۔ مگر میں ہنسا بسط بنی نقوی صاحب متواتر ہانچ منٹ تک منہا کے سب انکی طرف دیکھنے لگے۔ ارے بھی مجھے اپنا واقعہ یاد آگیا۔

”تم بھی کہہ ڈالو۔“ سب کی فرمائش ہوئی۔
 ”کہو گنا، پہلے ہنس لوں۔“ آخر خدا کر کے قسمت ختم ہوا تو بولے کہ
 ”اچھا ہنسنا نہیں۔“

”ایک ماہ قبل جب میں لکھنؤ میں تھا تو آنا میری ڈیوڑھی کے قریب وزیر گنج
 ایک محلہ ہے وہاں رہتا تھا۔ مکان وہاں بمبئی کی طرح نہیں ہیں۔ نہ لوگ ہی
 یہاں کی طرح ہیں۔ ایک منزل کا مکان، بڑا صحن۔ اندر جا کر ایک کھلی میں واقع تھا
 یہ بھی یاد رکھئے کہ شمالی ہند میں عموماً اور لکھنؤ میں خصوصاً عورتوں کا بہت سخت
 پردہ ہے چھ ماہ کے بعد مجھ کو مکان بدلنا پڑا۔ مالک مکان خود اس میں آگئے تھے،
 ابھی گولہ گنج میں لیا۔ حضرت گنج ”اودھ موٹر ورس“ روز سائیکل پر آنا اور روز جانا۔
 سائیکل بھی سڑک کو پہچان گئی تھی۔ مکان چھوڑنے کے تیسرے ہی روز میں ریس میں
 بہت سارے پیسے ہار گیا۔ متفکر اور پریشان آ رہا تھا۔ اس لئے دل ہی دل میں
 بہت کچھ سوچ رہا تھا۔ حضرت گنج سے امین آباد۔ اس کے بعد گولہ گنج۔ لب
 سڑک اپنا مکان۔ مگر ہماری سائیکل چلی جا رہی ہے۔ گھر دوزنکل گیا۔ گولہ گنج
 کا اتارا گیا۔ وزیر گنج کی سرحد آگئی۔ مگر ہم چل رہے ہیں یا ہماری سائیکل چلی جا رہی
 ہے۔ وزیر گنج کا موڑ آیا۔ ہینڈل اسی طرف کو مڑ گیا۔ پہلے مکان کی گلی آئی۔
 سائیکل سے اتر لئے، سیدھے ہاتھ میں سائیکل کا ہینڈل لئے ہوئے اور بابا یا لائق
 پتلون کی جیب میں ڈالے ہوئے ہیٹ پیڑ ہائے ہوئے اور گردن جھکائے ہوئے

پھر ہنسی شروع ہوئی مگر میں اب بھی نہ ہنسا۔ ابکی سب لوگ میری طرف متوجہ ہوئے۔

• ”آخر آپ کیوں نہ ہنسے؟“

میں نے کہا ”ایسی کوئی بڑی بات نہیں جس پر میں ہنسون۔“
”اچھا آپ اس سے بڑی کوئی بات کہیں گے۔ کہئے کہئے!“ سب کی صدا
آنے لگیں آخر مجھ کو بھی کہنا پڑا۔

”پچھلے سال میں بمبئی کی سیر کی غرض سے آیا تھا۔ میری واپسی میں چند ہی
روز باقی رہ گئے تھے کہ قمر صاحب جو میرے نئے دوست تھے اصرار کرنے لگے کہ
چلو آج والکیش، وہاں بڑی بڑی نیا ب تصویروں کا نیلام ہوگا۔ سب جارہے
ہیں۔ ہم بھی دیکھ آئیں۔

وہاں پہنچے تو دیکھا کہ بمبئی کا کوئی کرڑورپتی ایسا نہیں ہے جو وہاں نہ ہو۔
کوئی تصویر ایسی نہ تھی جو بیس ہزار سے کم پرچھٹی ہو۔ پہلے تو ہم ادھر ادھر ٹھاکے
اس کے بعد ہم ہر تصویر کے پاس جا کر اس کو غور سے دیکھتے تھے اور آپس میں،
آہستہ آہستہ لہجوں میں سر کو ہلا کر اس کے متعلق رہنما رک پاس کرتے
تھے۔ ہم کو دیکھنے والے یہی سمجھتے تھے کہ ہم بھی کوئی ہیں۔ ان میں سے ایک
تصویر نہایت نفیس تھی۔ ہر شخص اسے للچانی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ہم
بھی بہت دیر تک اس کو منگنی باندھے دیکھا کہ اور کر ہی کیا سکتے تھے

آخر کار تھوڑی دیر میں نیلام شروع ہوا۔ ہال نیلام کرنے والوں کی آواز سے گونج اٹھا۔ شروع میں تو قیمت طوفان کی طرح بڑھتی تھی۔ اور بعض آوازوں میں تصادم بھی ہو جاتا تھا۔ کچھ لوگ اپنی حد میں رہ کر ایک دو بولیوں ل کر خاموش کھڑے ہوئے تماشا دیکھتے تھے اور کچھ لوگ آخر دم تک پیچھا نہ چھوڑتے تھے۔

بعض دو آدمیوں میں صند بھی ہو جاتی تھی اور ایک دوسرے کی صند پر بولیاں بولتے تھے۔ جو صاحب اپنی حد تک پہنچ جاتے تھے وہ بات کو گردن نیچی کئے کھڑے ہو جاتے یا ہلٹے ہوئے دوسری طرف راہ جاتے تھے۔ ہم نے چند تصویروں کے نیلام میں لوگوں کی آواز، انداز اور بولی بولنے والے کے چہرے کا غور سے مطالعہ کیا جس تصویر کی قیمت زیادہ بڑھنے والی ہوتی تھی اس پر بولی لگانے والے کو رک کر بولتے تھے اور نیلام کرنے والا ان کی بولی کو دوسرے سے زیادہ نہ دہرانے پاتا تھا کہ دوسری آواز آتی تھی۔ ہر تصویر کے متعلق اس کی ممکن پیشین گوئیاں بھی سننے جاتے تھے۔ ان تمام باتوں کو مد نظر رکھ کر ہم نے قمر صاحب سے کہا کہ ہم بھی بولی لگائیں گے۔

وہ میرا منہ دیکھنے لگے۔۔۔۔۔ میں نے کہا کہ تھوڑی سی تفریح ہوگی۔ بولے: اگر بولی تمہیں پچھوٹی تب! میں منہں دیا۔۔۔۔۔ اب میں ہر تصویر پر بول رہا تھا۔

شروع میں میں بولی بولنے والوں سے بڑا گرم مقابلہ کرتا رہا۔ ہاں ہر کسی کے منہ سے رقم کا نام نکلا اور ادھر میں نے فوراً پچاس ساٹھ یا سو ڈیڑھ سو، صورت حال کو دیکھ کر اضافہ کر دیئے۔ ایک تصویر دوسو سے شروع ہوئی ایک سیٹھ اس کے بڑے گریڈہ معلوم ہوتے تھے۔ وہ دس ہزار کہتے تھے تو میں پچاس ہزار دیتا تھا۔ بڑا زبردست مقابلہ رہا۔ یہاں تک کہ ساڑھے تین ہزار تک پہنچ کر میں خاموش ہو گیا۔ وہ میری طرف گھور کر چلائے چار ہزار۔ بیلام کرنے والا چار ہزار دہرا رہا ہے اور مجھ کو دیکھتا جاتا ہے۔ کچھ لوگ مجھ سے کہتے ہیں آپ نے بہت دام کمائیے۔ میں منہس کر جواب دیتا ہوں ان دامنوں تو چیز اچھی تھی، پڑی رہتی۔ خیر وہی سیٹھ لے لیں۔ اب نہ بولوں گا۔

اس طرح سے تمام مجمع میں میں نمایاں ہو گیا۔ اب اس تصویر پر کنبھر آیا جو سب تصویروں کی جان تھی۔ ایک آگ سی لگ گئی۔ جو ہے وہ اسی کی طرف ٹوٹا پڑتا ہے۔ پانچ ہزار پہلی بولی تھی۔ ابھی پورے پانچ کہنے بھی نہ پائے تھے کہ ساڑھے پانچ سو رار کی دوسری طرف سے آواز آئی۔ ابھی وہ آواز ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ چھ ہزار ہو گئے۔

لوگوں کا خیال تھا کہ بیس ہزار تک جائیگی۔ اس لئے میں نے نڈر ہو کر آنکھیں بند کر کے پوٹنا شروع کیا۔ شروع میں تو میری آواز اس قدر حاوی نہ تھی اس لئے کہ ہر طرف سے بولیوں کا غلغلہ تھا۔ آخر میں صرف دو آدمی باقی

رہ گئے اور تیسرا میں تھا۔ باقی سب خاموش تھے۔

میں جب انیس ہزار پر پہنچا تو میرا حریف صرف ایک پارسی باقی رہ گیا۔
 جمع کی نظر میں اپنی طرف مڑی ہوئی دیکھ کر مجھ کو کچھ جھجک سی محسوس ہوئی
 اور اپنی پوزیشن کا احساس کر کے میری آواز میں ارتعاش پیدا ہو گیا۔ پارسی
 نے بیس ہزار کہے۔ نیلام کرنے والے نے دہرائے۔ مجھ کو دیکھا۔ پھر دہرایا بولا
 نایاب چیز ہے اور بڑھائیے اور.....

”بائیس ہزار“

یہ الفاظ بیساختہ میرے منہ سے نکل گئے۔ میں براہرگز ارادہ نہ تھا
 لیکن اس نیلام کی آواز نے مجھ پر کچھ ایسا اثر ڈالا کہ یہ الفاظ ادا ہو ہی گئے
 اب میں تھر تھار رہا تھا۔ قلب کی حرکت کی آواز کانوں تک آ رہی تھی۔ اور
 ہاتھ پیروں میں سنسنی پیدا ہو چلی تھی۔ پلٹ کر دیکھا تو قمر صاحب
 غائب تھے۔ اب صرف ایک امید تھی۔ میں نے پارسی کے چہرے پر نظر کی،
 مگر وہاں اس کے بولنے کا امکان ہی نہ تھا۔ کیا کروں گا؟ یہ سوال اپنے
 دل میں دہرا رہا تھا۔ میری جیب میں اس وقت ڈیڑھ سو کے نوٹ تھے
 اور گھر پر ڈاکخانہ کی کتاب میں پانچسو۔ یہ مکمل اثاثہ تھا۔ کوئی ایسا عزیز بھی نہ
 تھا جس کے پاس اتنی بھاری رقم ہوتی اور اگر ہوتی بھی تو ایک تصویر خریدنے کیلئے
 وہ مجھے کیوں دیتا۔ ہائے کیا کروں۔ میں اپنی انگلیاں مڑوڑ رہا تھا۔

بائیس ہزار، بائیس ہزار ایک دو۔ ایک دو، بائیس ہزار ایک دو
 میں سہارا لینے کے لئے ستون سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اور کانپتے ہوئے ہاتھوں
 سے رومال نکال کر پسینہ پوچھنے لگا۔ اُدھر پارسی رنج پھیر کر وہاں سے جا رہا تھا
 اور اُدھر میرا دماغ چکرار ہا تھا۔ یہاں تک کہ تین کی آواز ایک بجلی تھی جو میرے
 خزمین ہوش و حواس پر گری لیکن میں نے بلا کا ضبط کیا اور دل کو سنبھالنے
 کے لئے قریب رکھی ہوئی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں وہی پارسی میرے
 پاس آیا اور سرگوشی کے لہجہ میں کہنے لگا۔ ”دوسو روپیہ نفع بے کر تصویر
 چھوڑنے پر تیار رہو۔“

میں یہ سن کر دوبارہ زندہ گیا۔ لیکن اتنے قلیل نفع پر میرا دل آمادہ نہ
 ہوا۔ میں نے پانسو طلب کئے اور پانسو مجھ کو مل بھی گئے۔

(زیرنگ خیال)

تکلف

”اے ذوق تکلف میں تہ تکلیف سراسر۔“ یہ تو زبان زد عام مصرع ہے لیکن اس پر عمل کرنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا بیچ بولنے کی کوشش کرنا۔ بغرض محال اگر کوئی شخص کامیاب بھی ہو جائے تو وہ سوسائٹی کے لئے ایک مسلسل خطرہ بن جاتا ہے کیونکہ بے تکلفی موجب تکلیف ہے اور صداقت و لازار۔ یہ بات نوٹ کر لیجئے کہ محال کی قید دہقانیوں کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ متدین اور جذباتی انسانوں کے لئے ہے جن کے اخلاق کی عمارت دروغ مصلحت آمیز کے سنگ بنیاد ہی پر قائم ہے۔

خصوصیت کے ساتھ دسترخوان ایک ایسا میدان ہے جہاں تکلف اور سحر کی رکشتی کی جاتی ہے۔ یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ اس بازی میں میزبان جیتتا ہے یا میہمان۔ بہر حال اول الذکر کی دینگ اور آخر الذکر کا شکم اپنی اپنی قابلیت کا ثبوت ضرور دیتے ہیں۔ اندریں حالات اگر متقابلہ برابر کا ہو تو لطف آتا ہے لیکن کمی اور زیادتی میں تکلیف ہوتی ہے۔ جس طرح کھڑی ہوئی تینگ بچا رگی ڈھیل چھوڑنے سے ڈھے جاتی ہے۔ اسی طرح میزبان کی یکایک ڈھیل نہان کے توازن کو اس طرح متزلزل کر دیتی ہے۔ کہ وہ خود اپنی ہی جھونک میں

اگر گر پڑتا ہے۔ دسترخوان سے بہت دور۔ جہاں صرف چھچھوں اور پلیٹوں کی جھجکا کی صدا ہی پہنچ سکتی ہے اور طعام گوناگوں کی خوشبو، لیکن دست درازی ناممکن۔ ایسی حالت میں اس کی حالت ناگفتہ بہوتی ہے۔ گویم مشکل و گرنہ گویم مشکل، اسی خاص وقت کے لئے کہا گیا ہے۔

ایسے موقع کی نزاکت کا احساس اسی شخص کو ہو سکتا ہے جس پر کبھی ایسا معرکتہ الاراء واقعہ گزرا ہو۔ ممکن ہے کہ آپ ہم سے زیادہ قابل مہمہ دی ہوں۔ لیکن نہیں کہا جاسکتا کہ ذیل کے حادثہ کی روئداد سن کر بھی آپ اسی خیال پر قائم رہیں گے یا نہیں؟

ہماری سسرال لکھنؤ سے دور اور پنجاب سے قریب واقع ہوئی تھی جہاں ہم تازہ وارد تھے اور وہاں کی خصوصیات سے نا آشنا۔ سفر کی تکان اور ناشتہ کی کمی سے ہم گرسنہ ضرور تھے لیکن مٹھن کیونکہ ہم دیکھ رہے تھے کہ سر شام ہی سے ہماری شب کی دعوت کے انتظامات اعلیٰ پیمانہ پر کئے جا رہے تھے۔

آخر کار انتظار کی کشمکش سے ہم کو نجات ملی۔ ہندوستانی دسترخوان پر انواع و اقسام کی لذیذ و لطیف اغذیہ چنی گئیں۔ جن کی تخیلی صورت ہی نے ہمارے قوائے انہضام میں تحریک پیدا کر دی تھی اور اس حقیقت نے ہمارے دہن خشک میں آبیاری۔ فیملی کے ایک ممتاز رکن نے اس امر کی تحریک کی اور دوسرے اشخاص نے اس کی تائید۔ مگر ہم نے اس مجوزہ صدر کی طرح جو

گڑھی ممدارت کی طرف للچائی ہوئی، نگاہوں سے دیکھنا بھی رہے اور اس کے قبول کرنے سے رسماً انکار بھی کرتا رہے۔ دست بستہ عرض کر دیا کہ کیا کرواں طبیعت میں گرانی ہے، بھوک ہی نہیں ہے۔

ہمارے اس عذر کی ہم کو یقین تھا کہ کوئی سماعت نہیں کی جائیگی۔ لیکن انھوں نے ہمارے بیان کو عدالتی گواہوں کے حلیفہ بیان کی طرح صحیح مانتے ہوئے ضمناً ارشاد فرمایا کہ

”تکلف تو نہیں کر رہے ہو؟“

اب آپ ہی غور فرمائیے کہ ہم اس جملے کا جواب سوائے اس کے کہ نہیں کر رہے ہیں“ اور کیا دیتے۔ اسی دوران میں ایک طرف سے ہم کو مزید اصرار کی توقع تھی اور یقیناً بازی اپنے ہاتھ سے جلتے دیکھ کر ہم ان کے ایک خفیف سے اشارہ پر بھی لبیک کہنے کو تیار ہو جاتے لیکن اسی وقت ایک دوسرے صاحب جو اجد کو معلوم ہوا کہ ہماری شادی سے قبل خاتم کے ناکام امیدوار تھے محض ہم کو بھوکا رکھنے کے لئے ”شہر میں کالرا پھیلا ہوا ہے“ کی بے بنیاد روایت بیان کر کے خود گول ہو گئے۔ دوسرے خاموش اور ہم نخل۔ یقیناً لمبے اس خبر و حشت اثر سے کہ ہم تمام رات بھوکے رہیں گے ہمارے معدہ میں ایک انتشار عظیم برپا ہو گیا۔

میرے خیال میں گرمی عشق اور شدت گرسنگی اثرات کے محاط سے

ایک ہیں۔ اور یہی وجہ تھی کہ ”وہ منظر اب کا روندا ہوا سکون میرا“ میرا اس دقت
 صحیح موقع تھا۔ آہ!“ ہاتھ سے منہ تک آنے آتے چھوٹ پڑا پسینہ بھی۔“ تقدیر
 نام ہے۔ انہیں واقعات کا۔ میں دستہ خوان کے قریب بیٹھا ہوا پیلٹیوں اور
 پیالوں کو ندریٹا خالی ہوتے دیکھ رہا تھا۔ لیکن کچھ نہ کر سکتا تھا۔ کاش
 اس وقت زلزلے کا ایک جھٹکا محسوس ہوتا تاکہ کچھ نہ کچھ میری طرف بھی،
 ڈھلک آتا۔

آخر میں نا انصافی کسی طرح نہ برداشت کر سکا۔ اور ایک غیور میسجیل کشتہ
 کی طرح وہاں سے ”واک آؤٹ“ ہو کر اپنے کمرہ میں چلا آیا۔
 وہ کمرہ ڈوئس کے تلاطم میں فرسٹ خواب مرا

میرے لیٹنے کے بعد میرے پٹنگ کی کیفیت کا اندازہ کرنے کیلئے کافی ہے میں
 اپنی چھوٹی آنٹوں کو یقین صبر کرتا تھا لیکن میرے پیٹ کو کسی سپلو قرار نہ آتا
 تھا۔ گویا یہ بھی کسی ہجران نصیب کا دل تھا۔ مجھے ایسے تعلیم زدہ نوجوان پر جس نے
 آج تک روزہ رکھنے کا ارادہ بھی نہ کیا تھا ماہ رمضان کی صداقت کا اسی ہنگامہ
 شب کو یقین ہوا تھا۔

دو بجے رات کے ہماری عنان صبر ہمارے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور ہم نے
 ارادہ کیا کہ جائز یا ناجائز جس طریقہ سے بھی ممکن ہو ہم اپنی تواضع خود کر نیگیے۔ اس
 موقع پر نئی دھن کے سائے دستے سوال دراز کرنا گویا مگر کے لئے خود کو

زعفران کا کھیت بنادیا تھا۔ رہ گیا بازار جانے کا مسئلہ سو وہ بھی بیسود تھا۔ کیونکہ ہوٹل کھانا کھانے کی جگہ ہے نماز پڑھنے کی نہیں کہ ہر وقت کھلا رہے۔ اب ہمارے سامنے ایک ہی صورت تھی ”کریمین کی“ جو بیک وقت ہماری خانم کی رازداری سیلی، ان کی والدہ کی منتہی، گھر کی منجبر، باورچی خانہ کی چوکیدار اور ہماری بے تکلف دوست تھی۔

ہم ایک ناخوش کار چور کی طرح لرزاں وترساں اٹھے اور مشکل تمام باورچی خانہ پہنچے۔ راستے کی صعوبتوں کا حال بیان کرنا گویا سند باد جہاں کے دریائی سفر کی روئداد بیان کرنے کے مترادف ہوگا اس لئے قطع کیا جاتا ہے وہاں ہم نے کریمین کے پلنگ کے پاس پہنچ کر اس کے منہ پر جیبی لالٹین کا فوس ڈالا اور اس کی انگلی پکڑ کر جگانا شروع کیا۔ اس نے پہلے ایک طرف کی کرڈٹی اور اس کے بعد دوسری طرف کی۔ آخر ہم نے جی کڑا کر کے اس کے سارے سروں میں پکارا لیکن اس کا بھی کوئی اثر نہ ہوا۔ بجبوری ہم نے اس کی انگلی کو ایک ہکا سا جھٹکا دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بے تحاشہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور ”کون۔؟“ کی ایک دراوٹی چیخ نکالنے والی ہی تھی کہ ہم نے پک کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اس کو مطمئن کرنے کے لئے ٹاپچ کا بھیکہ اپنے منہ پر چھوڑ کر خود کو غلا ہر کر دیا۔

ہو گئی اور مجھ کو ایک ہلکا سا دھکا دیکر غصّہ میں کہنے لگی۔

”تم کیوں آئے اس وقت؟“

”مجھے بھوک لگ رہی ہے کرمین!“ میں نے گڑگڑا کر کہا۔

”ہبانے تراشتے ہو..... صبح ہونے دو شرمچا دو گی!“ اُس نے گرجتے ہوئے کہا۔

اس خلاف امید تنہید سے ہمارے ہوش و حواس رخصت ہو گئے اور ہمارے نظروں میں زمین اور آسمان گھومتے ہوئے معلوم ہونے لگے۔ دل کی حالت تھی کہ موٹر کے ٹیوب کی طرح پھٹ جائیگا اور دماغ کی یہ کیفیت کہ کھولتے ہوئے بانی کی طرح ابل جائیگا۔

”خدا کے لئے معاف کر دو۔ میں جانا ہوں۔“ میں نے دست بستہ عرض کیا۔

”میں بیوی کو دیتی ہوں آواز۔“ اُس نے میسرے کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

بس اُس وقت مجھے اپنی بکیسی اور غربت پر رونا آ گیا۔ آنسوؤں کے سیلاب اور ہچکیوں کے جھنکوں کا اس پر اتنا اثر تو ہوا کہ وہ کچھ موم ہو گئی اور سکایت کہنے لگی کہ مجھے آپ سے ایسی امید نہ تھی۔

میں پلٹ کر جانے والا ہی تھا کہ دفعۃً میرے پیچھے کچھ آہٹ سی محسوس ہوئی۔ ”ہائے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ یہ کہہ کر کرمین تو زمین پر بیٹھ گئی،

گر آنے والے شخص نے برقی ٹین پر ہاتھ رکھ کر ملبب کو روشن کر دیا۔
 میں اپنی بیوی کو جس کی آنکھوں سے آگ برس رہی تھی اپنے سامنے کھڑا
 دیکھ کر دھک سے رہ گیا۔

”کیوں جی تمہارے یہ گن ہیں۔“ ان کا چلا کر کہنا تھا کہ سارا مکان کھل بلا کر
 اٹھ کھڑا ہوا اور چشم زدن میں میرے چاروں طرف سارے سالیوں، ساسوں
 بھانجیوں کا گروہ کا گروہ کھڑا ہوا تھا۔ اور میں ہمارے لینے کے لئے
 ستون سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

(ساتھی)

گالی

علم و ادب کے میدان میں شعر پر لاتعداد مقالے تصنیف کئے جا چکے ہیں لیکن تعجب ہے کہ گالی پر کچھ تک ایک بھی پمفلٹ شایع نہ ہوا حالانکہ ہماری روزمرہ کی زندگی کے لئے جس طرح شعر کا احساس ضروری ہے اسی طرح گالی کا احساس بھی۔ یہاں تک کہا جاسکتا ہے کہ گالی جب انتہائی درجہ ارتقا پر پہنچ جاتی ہے تو شعر کہلانے لگتی ہے۔ اس لئے علم شعر کے متعلق ہماری تمام معلومات اُس وقت تک نشہ رہنمائی جب تک گالی کو جو شعر کی ابتدائی صورت ہے ہم ادب فلسفہ اور نفسیات کی روشنی میں جانچ نہ لیں۔

گالی کی تعریف۔ گالیوں کا مہنع جذبات کی فراوانی ہے۔ اس لئے شعر کی طرح یہ بھی وجدانی شے ہوتی جس طرح انجن میں بھری ہوئی بھاپ کے دباؤ کو کم کرنے کے لئے کچھ بخارات خارج کئے جاتے ہیں اسی طرح دل کا جھجھکا کر نئے کیلئے اور طبیعت کو راہ پر لانے کے لئے شعر کہے جاتے ہیں اور گالیاں دی جاتی ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ گالی اور شعر میں فرق کیا ہے؟ اس کا مختصر ترین جواب ”شعاع کی ذہنیت“ میں مضمر ہے۔ وجدانیات کے تحت

ہر وہ عبارت کہ جو علامہ پڑھی جائے شعر ہے اور جس عبارت کا علامہ پڑھنا، بولنا اور سننا مندرج ہو وہ گالی ہے۔ اس نقطہ نظر سے خلوت میں شعر اور گالی کے درمیان کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا۔ یہ تعریف ہندوستان کی تمام اقوام، فرقوں اور طبقوں کو محیط کر لیتی ہے جن میں جاہل اور عالم کی کوئی تخصیص نہیں۔ البتہ افراط و تفریط کا سوال ہے۔

گالیوں کی تقسیم (باغیاری معنی) (۱) اسی ”وہ گالیاں کہ جن میں محض نام لے دیا جاتا ہے۔ اس صنف میں چند نام ہیں۔ کہ جو سوسائٹی میں شجر ممنوعہ کی سی حیثیت رکھتے ہیں اور یہی ممانعت اس خیالی دنیا میں لذت پیدا کرنے کیلئے کافی ہے۔ اگر زبان کے اس سنسکر کو اٹھالیا جائے تو گاندھی کے نمک کی طرح ان میں بھی کوئی چاشنی نہ رہیگی۔ اور مخصوص طریقہ سے بچے گالی کی تکرار پر پھر ہونگے۔

(۲) خبری۔ ”وہ گالیاں کہ جن میں محض اظہار واقعہ کر دیا جاتا ہے جس کا خلیق مخاطب کی ذات سے ہو سکتا ہے یا اُس کے خاندان سے۔ تاثرات کے لحاظ سے پہلی صورت میں وجدانی کیفیات کا مظاہرہ اس قدر مبہمت نہیں ہوتا جس قدر کہ آخری صورت میں، اندریں حالات داد دینے میں مخاطب کی زبان ہی حصہ نہیں لیتی بلکہ تمام جسم کا اشتراک عمل ہوتا ہے۔ جس کے اثرات اکثر صورتوں میں دیر پا ثابت ہوتے ہیں۔ بشرطیکہ طریقین میں ”ذوق ثقیل“ کی کمی نہ ہو۔

ایسی تمام گالیاں کم و بیش جنسیات کے تحت میں آتی ہیں جو ایک

کتاب ہے غلط فہمیوں کے مسلسل ابواب کی۔ جنسی گالیوں کے ماتحت جو نقص امن کی وارداتیں رونما ہوتی ہیں ان کا ایک حد تک یہی سبب ہے کہ مہذب دنیا کا انسان حقیقت کو دیکھنے اور سننے کی صلاحیت سے بے بس رہ رہ چکا ہے۔ شاید اسی وجہ سے عربی میں الحق مر کہا گیا ہے۔

(۳) ”تخیلی“ وہ گالیاں کہ جن میں دیرینہ آرزوں کا تخیل شامل ہوتا ہے۔ ایسی صورتوں میں ایک گالی اور (گالی دینے والا) اپنے مخاطب کے عزیزوں سے اپنے ذہن لاشعوری میں ایک رشتہ قائم کرنا چاہتا ہے لیکن چونکہ اس کی تکمیل کا امکان نہیں ہوتا اس لئے صورتوں اور ارا مانوں کی زبانی تکمیل ہی دل کو خوش کر لیتا ہے۔

(۴) ”وصفی“ وہ گالیاں کہ جن میں کوئی نمایاں صفت بیان کر دی جاتی ہے۔ یہی وہ صنف ہے جہاں سے گالی اور شعر کی سرحدیں ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتی ہیں اور شاعر اور گالی دہنی کی ہستی ایک دوسرے سے موصول، زبان کی وسعت، خیالات کی نزاکت، تشبیہوں اور استعاروں کی خوبیاں بہت سے شروع ہوتی ہیں گالی وسیع ہو کر پھنتی۔ ضلع جگت اور ہزل و ہجو کے مرتبہ تک پہنچ جاتی ہے۔ طنزیات ایک مستقل فن ہے جس کی پرداز شعر کی نازک خیالی سے بھی پرے ہے۔ اس کی اہل گالی ہی ہے جس کو کراہیت کے بجائے نفاست، ثقالت کے بجائے نزاکت اور بیباختگی کے بجائے تکلف اور تصنع

سے راستہ کر کے ارتقا کی منزل آخر تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئین کی کڑوی گولی پرنسکر کا قوام۔ لیکن طبعی خواص دونوں کے تبدیل نہیں کئے جاسکتے۔

گالیوں کے محرکات ، (۱) جذبہ مغضب ، تمام وہ اشیاء جو انسان کی جسمانی اور روحانی اذیت کا موجب ہوتی ہیں اور اس کی خواہشات کی تکمیل میں سد راہ۔ وہ اس جذبہ کو بھڑکاتی ہیں۔ خواہ ذی روح ہوں یا غیر ذی روح۔ ایسی حالت میں انسان اپنی اسکا فی طاقت صرف کر دیتا ہے کہ ان اشیاء کو فنا اور برباد کر دے۔ یہاں تک کہ جب وہ عاجز آجاتا ہے تو اس کو خود اپنی ذات پر بھی غصہ آتا ہے۔ اور اس آخری کوشش میں وہ اپنے جسم اور روح دونوں کو قربان کر دیتا ہے۔

کائنات کو محفوظ رکھنے کے لئے قدرت کا یہ اصول کہ انسان خدا نہیں بن سکتا اور خدا انسان نہیں بن سکتا۔ حکمت پر مبنی ہے۔ وگرنہ دونوں صورتوں میں ہمارے لئے ہر روز روزِ حشر اور ہر شب قیامت کی رات ہی ہوتی۔ بہر حال قدرت نے ایک دوسری پیش بندی بھی کی ہے اور وہ یہ کہ انسانی فطر کے اس تخریبی عنصر کو کم کرنے کے لئے اس نے انسان کو گالیاں سکھا دیں تاکہ زیر دستوں اور زبردستوں میں تقصیف کی صورت زبانی ہی رہے۔ لیکن ان پیش بندیوں کے باوجود کمزوروں کی زبان درازی کبھی کبھی شہ زوروں کی دست درازی میں خیرک

بیدا کر دیتی ہے۔ لیکن اگر تہذیب یہ چاہتی ہے کہ ضعیفوں کے پاس گالیوں کا آخری حربہ بھی باقی نہ رہے تو میں سوائے اس کے اور کیا کہوں کہ غریبوں کا اللہ والی۔

اس وقت کو رفع کرنے میں قرآن شریف نے متمدن انسان کو گالی کا ایک بہترین عوض عنایت فرمایا تھا اور وہ ”لا حول ولا قوۃ الا باللہ“ تھا۔ لیکن ہم ہندی مسلمانوں کا خدا بھلا کرے کہ ہم نے اس کو اپنے محاورہ میں ”لا حول و کجوب“ اور ”لا حول پڑھو“ بنا لیا ہے جس سے عام مفہوم گالی ہی کا لیا جاتا ہے۔ اگر کسی کو اس میں شک ہو تو ایک غیرت دار مسلمان پر تجربہ کر کے دیکھ لو

(۲) جذبہ محبت۔ گالیاں عداوت میں دلچسپی پیدا کر دیتی ہیں اور محبت میں چاشنی، صورت اول میں ان کو گالیاں کہتے ہیں اور صورت آخر میں ”سہا لیاں“ کہتے ہیں۔ ماؤں کی گودیں بچوں کے لئے گالیوں کا بہترین بکول ہیں اور شاعروں کی غزلیں گالیوں کا جامع نصاب۔ اگر اپنے دوستوں کو دُعا دے اور اپنی اولاد کو فرمانبردار بنانا چاہتے ہو تو ان کی مارات گالیوں سے کرو لیکن دفتر میں نام پیدا کرنے اور صاحب کے دل میں جگہ پیدا کرنے کے لئے یہ دُعا عمل مفید نہیں۔ ایک تجربہ کار اور ممتاز ہیڈ کلرک نے اپنے دفتر کے ایک نوآموز کلرک کو ایک دن حسب ذیل مشورہ دیا۔ نوجوان کلرک نے کاغذات کا فائل ہیڈ کلرک کی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

”میں آج صاحب کے پاس دستخط کرانے نہیں جاؤنگا۔“

”کیوں؟“

”صاحب کچ موڈ میں نہیں ہیں، ڈیم فول کی آوازوں سے کمرہ گونج رہا ہے۔“
”میں پوچھتا ہوں کہ کیا تم جلد مستقل ہونا چاہتے ہو؟“

نوجوان نے سر ہلادیا۔

”تو ایسے موقعوں پر جبکہ صاحب موڈ میں نہ ہوں بلا ضرورت بھی چلے جاؤ
احتیاطاً کانوں میں روئی ٹھونس لیا کرو۔“

نوجوان خاموش رہا۔

”کیا تم میری کرسی پر بیٹھنا چاہتے ہو کیونکہ میری نپشن کے دن قریب ہیں؟“
”نہ نوجوان سسکا دیا۔“

”تو منتظر رہو کہ صاحب تمہارے لات ماریں۔“

نوجوان کے چہرے پر شکن آگئی۔

”تو استعفیٰ تیار رکھو تا کہ وقت ضرورت کام آئے۔“

(۴) اظہارِ طاقت۔ ایک فرد کو اپنے دوسرے ہم جنسوں پر فوقیت جتانے کے لئے چند لوازمات کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً علم، دولت، لباس، حسن وغیرہ لیکن جن لوگوں کے پاس اظہارِ طاقت کے تمام ذریعے مفقود ہوتے ہیں اُن کا مہمہ موتیوں کے بجائے گالیوں سے بھرا رہتا ہے۔ یہ بات نوٹ کر لیجئے کہ صاحب اور پولیس اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں۔

(۴) ہمدردی و نقل۔ فیشن ایسل چیزوں کی طرح گالیاں بھی وبائی ہیں دونوں میں ایجاد و اختراع بھی ہوتی رہتی ہے۔ لیکن ان میں فرق یہ ہے کہ ایک کے موجب اپنا اشتہار دیتے ہیں اور دوسری کے موجب گناہ ہی رہنا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں کی اہمیت بھی مسلم ہے۔ کہ جو ان تمام اختراعات کو قدیم خرافیات کی طرح محفوظ رکھتے ہیں اور اپنی سوسائٹی میں سینہ بسینہ منتقل کرتے رہتے ہیں۔ ایسی اقوام جو گالیوں کو محض تکیہ کلام اور فیشن کے لحاظ سے استعمال کرتے ہیں ان میں زیادہ تر ہندی انگریز ہیں

گالیوں کی زبان۔ ہندوستان میں ہندو مت میں خواہ وہ قدیم ہو یا جدید ہمیشہ سے بدیشی اشیا کی سرپرستی کرتی رہی ہے جن میں حکومت اور زبان مخصوص طریقہ سے بیرونی ہی رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دیسی گالیاں حقیر خیال کی جاتی ہیں اور بدیشی گالیاں معزز۔ یعنی گالیاں بالذات ممنوع نہیں ہیں بلکہ بالذات ان ممنوع ہیں۔ وہ تمام الفاظ جو دیسی زبانوں میں گالیوں کے مفہوم کو ادا کرتے ہیں اعلیٰ لغت اور مذہب جماعت سے خارج کر دیئے گئے ہیں لیکن اگر وہ ہی مفہوم بدیشی زبانوں میں ادا کر دیا جائے تو دونوں میں شامل کر لئے جاتے ہیں نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے جہلا کی تمام گالیاں بازاری ہیں اور ان کے جہلا کی گالیاں محکمائی۔ گویا ہم کو اپنی زبان میں غصہ کرنے کی بھی اجازت نہیں۔

گالیوں کی تقسیم (بالحاظ زبان) (۱) موٹی گالیاں جن سے احصاست

کو ٹھیس لگتی ہے اور تنفر اور کراہیت کے تمام آثار جسم اور چہرے پر نمایاں ہو جاتے ہیں۔ یہ دراصل کسی زبان میں نہیں پائی جاتیں۔ سوائے ہندوستان کی ایسی زبان ٹھیٹھ ہندی کے۔ ان کی سرپرستی ہمارے جہلاء کا طبقہ کیا کرتا ہے ورنہ یہ کب کی نفقود ہو گئی ہوتیں۔

رسمی گالیاں، اسی قبیل کی گالیاں ہیں۔ کہ جو روانتی طور سے ہمیں قدیم ہندوستان سے موصول ہوئی ہیں۔ اور ہماری مذہب سوسائٹی میں جبکہ پائی گئی ہیں۔ یہ گالیاں ہم لوگوں کی زبان سے ہمیاختہ نکل جاتی ہیں۔ لیکن ہوا کی لہروں میں اس قدر جلد کھو جاتی ہیں کہ سامعین کے کانوں تک بھی نہیں پہنچ سکتیں۔ یا اگر پہنچتی بھی ہیں تو ہمارا تلفظ اور لہجہ ان کے روپ کو بدل دیتا ہے۔ ہندوستان میں موٹی گالیاں رامپور کی اور بمبئی میں ہندی بازار کی مشہور ہیں۔ ”رسمی گالیاں“ علی گڑھ، لکھنؤ، لاہور اور حیدرآباد کی کھسالی خیال کی جاتی ہیں۔

(۲) گوری گالیاں۔ دوستوں کو چھیڑنے، مذاق بنانے، بچوں کو ستانے اور تڑپانے کا وسیلہ استعمال ہوتی ہیں۔ اس صنف میں کسی خاص زبان کی تخصیص نہیں ہے البتہ فی زمانہ انگریزی ان کی جگہ سرعت سے لے رہی ہے۔

(۳) شرعی اور علمی گالیاں، ان کے لئے بلا استثنا عربی، فارسی اور سنسکرت زبانیں استعمال کی جاتی ہیں۔ چنانچہ تمام ہندوستانی واعظوں خطیبوں اور

پنڈتوں کو انھیں زبانوں میں جلال اور غصہ آتا ہے۔

گالی اور پلشتے۔ عام طور پر یو فراوشہ رایت کے درمیان امتیازی نشان گالیوں کا خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن میں نے آج تک اس شریف آدمی کی صورت نہیں دیکھی کہ جو اندھیرے میں کسی سبز بالنگ سے ٹک کر کھا کر گرا ہو اور اس نے اس چیز کی شان میں ایک تازہ تازہ فصیح و بلیغ قصیدہ نہ پڑھا ہو۔ نہ صرف یہی بلکہ میں ایسے آدمیوں کو بھی جانتا ہوں جنہوں نے اس سبکناہ شے کی لات نوازی بھی کی ہے اور صبح اٹھ کر خود ہسپتال گئے ہیں اور صبح شے کو پڑھنے کے کارخانہ میں مرمت کے لئے بچھوایا ہے۔ اسی طرح اگر یہی تکلیف آپ کو کسی انسان کے ہاتھوں پہنچتی ہو۔ جسمانی یا روحانی تو میں یقین نہیں کر سکتا کہ آپ اس وقت لکھنؤ اور دہلی کی زبان میں فرمائینگے کہ دیکھئے خبردار ہے ورنہ آپ کی مادرِ محترمہ کی شان میں میرے دہن سے چند گستاخانہ الفاظ صادر ہو جائینگے یا اگر خدا نخواستہ آپ کو کوئی شخص معذور اور مجبور سمجھ کر آپ کے جسمِ اطہر سے بے ادبی کرے تو میں نہیں خیال کر سکتا کہ آپ اس وقت اقبال کا شکوہ سوز و دمان کے ساتھ پڑھینگے۔

اس بیان سے معلوم ہوا کہ گالی عین اقتضاءِ فطرتِ انسانی ہے۔ البتہ بعض لوگ ضرورتاً استعمال کرتے ہیں اور بعض لوگ عادتاً۔ دھل آکر اذکر طبعہ ہی پر ہماری اصطلاح گالی و مرادق آتی ہے اور جہاں کہیں ہم نے اس لفظ کو استعمال

کیا ہے۔ وہاں کم و بیش اسی معنی کے ماتحت کیا ہے۔

لوگوں کا عام خیال کہ گالی ورد در اصل طبقہ جلا میں پیدا ہوتے ہیں غلط ہے، اس کا تعلق فی الحقیقت انسان کی فطرت، قومیت، پیشے اور ماحول سے ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ تعلیم بھی ایک قسم کا ماحول ہے۔ لیکن مسلم ماحول نہیں ہے۔ بلکہ اس کا ایک حصہ ہے۔ اس لئے وہ فطرت انسانی کو یکسر تبدیل نہیں کر سکتی وگرنہ چند نسلوں کی تعلیم کے بعد بچے خود بخود تعلیم یافتہ، ہندو اور متہن پیدا ہونے لگتے۔ اور ان کو ابتدائے عمر سے سکولوں اور کالجوں میں بھیجنے کی ضرورت باقی نہ رہتی۔ اپنے بیان کی تائید میں ہم ہندوستان کی دو تعلیم یافتہ اقوام پارسی اور ہندی انگریزوں کو پیش کریں گے اور ان کے نفسیات کا مطالعہ کر کے ان کے بع تحقیق کریں گے کہ ان کی قومیت پر گالیوں کا اتنا گہرا رنگ کیوں چڑھا ہوا ہے؟

پارسی۔ ان کی گالیاں تجارتی ہوتی ہیں۔ جن کی مدد سے ان کی گفتگو، دیکھ بھال اور ان کا بیان پر زور ہو جاتا ہے۔ من حیث القوم پارسی جسمانی لحاظ سے نازک واقع ہوئے ہیں اس لئے ذرا زبان دراز ہیں ضعیف عورتوں کے سروتوں کی طرح ان کی زبان چلتی ہی رہتی ہے لیکن ان کی گفتگو کا عنوان علمی اور فلسفی نہیں ہوتا۔ بلکہ نوجوان لڑکیوں کی گفتگو کی طرح ذاتیات سے متعلق ہوتا ہے۔ وہ بے انتہا تجارتی اور علمی انسان واقع ہوئے ہیں۔ اسی لئے ان کا لائق بھی ایک قسم کا تجارتی سرمایہ ہے۔ اور ان کی گالیاں سنہری کجیاں ہیں

جن سے جنبیوں کے دل کا قفل بہت جلد کھل جاتا ہے۔ معاشرت کی اوٹ ہٹ جاتی ہے اور چشمِ زدن میں تپے کلفی ایسی پیدا ہو جاتی ہے کہ گویا کبھی غیب تھم ہی نہیں۔ مقاصد کی تکمیل کے بعد ان کی دوستی متاع کی طرح وقت معینہ پر ختم ہو جاتی ہے۔

ہندی انگریزی۔ دراصل ایک معمہ ہیں۔ ہندوستانی ان کو انگریز خیال کرتے ہیں اور انگریز ان کو ہندوستانی۔ ان کی گالیاں سو فیصدی انگریزی ہوتی ہیں لیکن ان کو استعمال کرنے کے تمام موقعے ہندوستانی۔ چونکہ ان کا وجود دونوں اقوام کی متحدہ لغتِ شول کا نتیجہ ہے اس لئے ترکہ اور ورثہ میں اس کے سوا اور کیا مل سکتا ہے۔

مارواری۔ اسی سلسلہ میں تمام سود خوار اقوام بھی شامل ہیں۔ ان کا شمار ایک طریقہ سے گالی وروں میں نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ یہ صرف سستے ہیں دیتے نہیں۔

مزدور۔ بعض انسانوں میں فطرتاً مارنا اور مار کھانا دونوں قسم کی جبلتیں ولعیت کی گئی ہیں۔ مزدوروں میں یہ بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اسی لئے وہ کمزوروں کو مارنے کی خاطر گالی دیتے ہیں اور زبردستوں کو مار کھانے کی خاطر گالی دیتے ہیں۔ لیکن سرمایہ داری کے تشکج میں پھنس کر ان کا بیشتر حصہ ان جبلتوں سے محروم کر دیا گیا ہے اور ان کے بجائے ان کو قدرتی

گالیاں دینا اور گالیاں سننا بخش دیا گیا ہے۔

جس طرح کثرت استعمال کے بعد فیچموں کیلئے ایفون بھی خراب جاتی ہے۔ اسی طرح ان کے لئے گالیاں جزو کلام بن گئی ہیں۔ اس حد تک پہنچنے کے بعد یہ لوگ واقعی بیگناہ اور بھیر ہو گئے ہیں۔ کیونکہ ان کی نیت دراصل کسی کے احساسات کو صدمہ پہنچانے کی نہیں رہی بلکہ یہ لوگ دوست دشمن، عزیز اور غیر سب سے ایک ہی طرح ہم کلام ہوتے ہیں۔ مزدوروں کے کار فرما اور ہندوستان کی پولیس ان کے احساسات کی موت کے راز سے خوب واقف ہو گئی ہے اور اسی لئے ان کی لیاقت کے مطابق بات کرتے ہیں۔ اور فائدہ اٹھاتے ہیں۔ چونکہ ان کی تذکرہ بالا جہلتوں کے ارتقاء کی وجہ صرف یہی ہے کہ ۶

ایک ہنگامہ یہ موقوف ہے گھر کی رونق،

اس لئے دن بھر کی شدید محنت کے بعد بیچارے گالیوں کا مشاعرہ منعقد کر کے دل بہلا لیتے ہیں۔

جنما وریان۔ اس طبقہ میں تمام وہ لوگ شامل ہیں۔ کہ جو اپنے دن کا بیشتر حصہ جانوروں کی صحبت میں گزارتے ہیں۔ مثلاً کسان جو بیلوں سے ہل چلاتے ہیں۔ کھارے والا اونچی نیچی پگڈنڈی پر مردہ بیلوں کی مدد سے رینگتا ہے۔ بکے۔ تانگہ اور گاڑیاں۔ میونسپلٹی۔ ڈسٹرکٹ بورڈ۔ پولیس اور

سوارپلوں کے بوجھ سے لدا ہوا زندگی کے دن کا ٹٹ ہے۔ جانور اور انسان کی اس مسلسل کشمکش میں دونوں اپنی اپنی زندگی سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ ایک اڑ جاتا ہے اور دوسرا بے صبر ہو کر گالیوں پر اتر آتا ہے۔ لیکن ایک دوسرے کو خوب پہچانتے ہیں۔ کبھی کبھی لات اور چابک کا طریقہ میں تبادلہ ہو جاتا ہے۔

سب سے زیادہ محسوس گالیاں اسی طبقہ کی ہیں اور مخصوص طریقہ سے کاشتکار کی۔ کہ جس کے دُکھ درد کا کوئی شریک نہیں سوائے دو بیلوں کے۔ اس کی گالیوں میں درد ہوتا ہے۔ التجا ہوتی ہے اور شکوہ ہوتا ہے مگر ظلم نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ خود مظلوم ہے کیا اس کی پیٹھ پر فوجدار، زمیندار، اور تحصیلدار کے نازیبا نہیں پڑتے؟ یہی وجہ ہے کہ بیل اس کو لات نہیں مارتے۔

گالیاں کا فن۔ میں اس پر بالآخر تفصیل رائے زنی نہیں کر سکتا لیکن اشارۃً حضرت غالبؒ کا مشورہ درج کئے دیتا ہوں۔ جس کو پڑھ کر آپ خود اپنی رائے قائم کر لیں گے۔

غائب مرحومؒ کی حیات میں ایک کتاب کی تحریر پر ہندوستان کا ”سویانہ فرقہ“ آپ سے اس حد تک ناراض ہو گیا تھا کہ خطوط میں ہندوستان کے اطراف و جوانب سے گالیوں کے پارسل روزانہ بھیجے جاتے تھے۔ چنانچہ ایک میں کسی نے آپ کو ماں کی گالی بھی دی تھی۔ اس وقت آپ نے

حالی مرحوم سے فرمایا تھا کہ افسوس ہے اس شخص کو گالی دینا بھی نہیں آتی۔ مجھ
 ضعیف اور عمر رسیدہ کو ماں کی گالی دینا حماقت ہے۔ دراصل

بچے کو ماں کی گالی
 جوان کو بیوی کی گالی
 اور بوڑھے کو بیٹی کی گالی دی جاتی ہے۔

(ساتھی، نظریہ سب)

نوک جھونک

افراد پروفیسر محمود - زندگی کی ستم ظریفیوں کے شکار - زمین کی
 پچاس گز شنیں دیکھے ہوئے -
 بیگم روشن آرا - چہرے پر حُسنِ ماضی کے شکستہ آثار - پروفیسر
 سربانج برس چوٹی - رشتہ کے لحاظ سے چچا زاد
 بہن اور قانون کے لحاظ سے منکوحہ بیوی -
 منصور - ... سات سال کا معصوم بچہ -
 دردانہ { بہنیں - آپس میں حقیقی اور پروفیسر اور
 ریحانہ { بیگم کی چچا زاد -

سین پیلا

تعارف - [ایک آراستہ کمرے میں جسے ہندوستانی اور انگریزی تہذیب
 کا مکچہ کہنا چاہئے پروفیسر کھڑے ہوئے دارھی مونڈ رہے ہیں منصور کو بیگم
 چائے پلا رہی ہیں - دردانہ و ریحانہ میز کے قریب بیٹھی ہوئی عصمت کا سانپا پڑھتی ہیں -]

بیگم - (بیابی میں چاء انڈیلتے ہوئے) منصور! (اتنے زور سے پکارتی ہیں کہ بچہ گھبرا جاتا ہے اور بیابی کو ہاتھ سے گرد تیل ہے) نیکی اترے تمہارے اوپر، قبر میں پیر لٹکائے بیٹھے ہو اب تو کلے پھیلنے سے باز رہو۔ آخر یہ روز روز سشیو کرنے سے فائدہ کیا؟

پروفیسر - (اس طرح جیسے سنا ہی نہیں) منصور!

منصور - جی پایا!

پروفیسر - بیٹا تم نے ہماری قمیض میں رنوک کر دیا۔

منصور - (خائوش)

بیگم - بیٹا منصور! تمہاری قمیض پرانی ہو گئی ہے، رنوک کی گنجائش ہی نہیں۔

پروفیسر - ہونہ۔ دل میں نہ ہوگی۔ قمیض میں تو ہے۔ میں تم سے

کہتا ہوں منصور!

بیگم - قمیض سوئی کی ایک نوک بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ دل طعنوں

اور خچکیوں کے سینکڑوں نشتر برداشت کر سکتا ہے۔ میں تم سے

کہہ رہی ہوں منصور!

پروفیسر - بیٹا لاؤ میں اس قمیض کو پھاڑ ڈالوں۔

بیگم - پرانی چیزوں کا یہی مصروف ہے منصور!

پروفیسر - کاشکہ پرانی ہولیوں کا بھی یہی مصروف ہوتا۔

بیگم - اسی کے ساتھ پرانے شوہروں کا بھی -
 (پروفیسر خاموشی کے ساتھ حلام کا رخ کرتے ہیں - دردانہ اور ریحانہ ایک دوسرے
 کو مسکرا کر دیکھتی ہیں اور میز پر سے اٹھ کر بیگم کے پاس آکر بیٹھ جاتی ہیں)
 دردانہ - اے باجی!

ریحانہ - اے باجی!
 بیگم - کہو!

دردانہ - (مسکرا کر) منصور آپ کا بہت شہریر معلوم ہوتا ہے -
 بیگم - کیوں - کیا ہوا؟

ریحانہ - دولہہ بھائی کی قہیض میں رفو نہیں کرتا -
 دردانہ - شیوہ کئے جاتا ہے دائرہ نہیں رکھتا -

بیگم - (کھسیانی منہی منہتے ہوئے) اب میری زندگی کا سہارا منصور ہی ہوتا ہے
 ہم دونوں کے درمیان مغائرت اور نفرت کی ایک دیوار حائل ہو گئی ہے،
 جو گر نہیں سکتی - ہاں بڑھ سکتی ہے - تین سال سے یہی عالم ہے - البتہ منصور
 ایک سوراخ کا کام دیتا ہے جس کے پردے میں ہم ایک دوسرے سے مطلب کی بات
 کہہ لیتے ہیں - اگر منصور نہ ہو تو میں خاموشی کا روزہ رکھ لوں -

ریحانہ - یہ کشیدگی کس بات پر ہوئی؟
 بیگم - بلا وجہ!

دُر دَانہ - آپ دونوں کی محبت تو شہر بھر میں مشہور تھی۔
 رِجَانہ - محبت کی افراط کا یہی شر ہوتا ہے۔
 بیگم - اب دلوں میں گرہ پڑ گئی ہے۔ ایک دن اٹھ کھڑی ہونگی۔
 (آنسو گرنے لگتے ہیں۔ اٹھ کر منہ دھونے جاتی ہے)
 دُر دَانہ - چلو ان دونوں میں ملاپ کرا دیں۔
 رِجَانہ - یوں کہو کہ جنگ کرا دیں۔
 دُر دَانہ - کیوں؟

رِجَانہ - تاکہ خود بخود ملاپ ہو جائے۔ جانتی ہو سوتی ہوئی محبت کو
 بیدار کرنے کے لئے اور جاگتی ہوئی دشمنی کو سلانے کے لئے کس چیز کی ضرورت
 ہے؟ جنگ کی! یہ لوگ بہت زیادہ خود دار ہیں۔ خطاؤں کو دل میں رکھ کر
 پرورش کرتے ہیں اور پھانس کا بالنس بنا دیتے ہیں۔ دل کھولتا ہے
 جس میں ابجرات آتش فشاں کا ماہ بن جاتے ہیں۔ ان کو نکلنے کا راستہ
 ملتا نہیں اس لئے طبیعت میں زلزلے آتے رہتے ہیں۔ طبیعت اور پانی دو
 چیزیں ہیں جن کا رکنا طوفان اور سیلاب لاتا ہے۔ اس لئے دور دیکھئے ہوئے
 دوستوں میں ملاپ کی کوشش نہ کرو۔ بلکہ ان کو ایک دوسرے سے ٹکرا دو
 اور لڑا دو۔ دل کھول کر گرم گرم آنسو جلتی ہوئی آہیں اور سلگتی ہوئی سسکیاں
 محبت کی دبی ہوئی چنگاریوں کو بھڑکا دینگی اور یہ سرد دھری چشم زدن ہیں مگر

میں تبدیل ہو جائیگی۔

دُر دَانہ - ماشاء اللہ زبان کیا ہے۔ لطافت و شیرینی کا دریاب ہے۔ اچھا،
کون سا ممب چھوڑو گی؟

ریجانہ - ممب کی ضرورت نہیں، میں پروفیسر کے چابی بھرتی ہوں۔ او
تم باجی کے بھرو۔ اس کے بعد ہم تم دونوں اس ڈرامے میں بلا ٹکٹ بیٹھ کر
لطف اٹھائیگی۔

دُر دَانہ - سمجھی!

(بیگم چا، نبا کر لاتی ہے اور منصور کے ہاتھ میں دیکر پروفیسر کی طرف اشارہ کرتی ہے،

جسے وہ جا کر میز پر رکھ آتا ہے۔ پروفیسر حمام میں سے ہنا کر کمرہ میں داخل ہوتا ہے)

دُر دَانہ - (ریجانہ کی طرف دیکھتے ہوئے) باجی کچھ اور بھی سنا؟

بیگم - کیا؟

دُر دَانہ - بھائی عرشی کو خان بہادر کا خطاب ملنے والا ہے۔ کیوں ریحانہ!

اگر باجی کی شادی وہاں ہو گئی ہوتی تو؟

بیگم - (ٹھنڈی سانس بھر کر) بہن! میری قسمت میں تو پھٹی ہوئی قمیضوں
کو فرو کرنا لکھا ہوا تھا۔

پروفیسر - (چائے کی پیالی کو میز پر رکھ کر) پھر ان کے ساتھ شادی کرنے سے کیوں
انکار کر دیا تھا۔ کیا میں نے خوشامد کی تھی۔؟

بیگم۔ (کرسی پر سے اٹھتے ہوئے) کیا اب مجھے ملعون کرنے کا ارادہ ہے۔
یہ جان دینے اور خود کو مٹا دینے کا ثمرہ مل رہا ہے۔ خدا تم سے بدلہ لے۔

ریحانہ۔ اے کیوں بیکار لڑتے ہیں آپ دونوں جو کچھ ہوا وہ اچھا ہوا۔
دردانہ۔ (بناوٹی غصہ میں) تم بڑی وہ ہو۔ تم کو کیا ضرورت تھی کہ بھولے
ہوئے افسانے دہرا کر باجی کے زخموں پر نمک مریچ چھڑکو۔

بیگم۔ دم بخود بیٹھی رہتی ہوں۔ بات کرنی ہی چھوڑ دی ہے۔ اس پر بھی
حال ہے کہ گلابانے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔

دردانہ۔ صبر کیجئے بہن! ہم ہندوستانی عورتوں کے لئے دنیا جہنم ہے
مردوں کی فرعونیت کی انتہا ہو گئی ہے۔ جس یورپ کی رٹ لگاتے رہتے
ہیں اگر وہاں پہنچا دیئے جائیں تو دوسرے دن بلا ٹکٹ وہاں سے
واپس آجائیں۔

پروفیسر۔ یہ خاکسار کی طرف اشارہ ہے۔ کیا تم کو علم نہیں کہ میں انجمن
تحفظ حقوق نسواں کا صدر ہوں۔

دردانہ۔ یہی تو اور بھی رونما ہے۔ بھیلوں کے گلے بان بھیلے بن گئے
ہیں۔ میں آپ کو نوٹس دیتی ہوں کہ میں ایک ایسی ہی دوسری انجمن بناؤں گی
اور اس کا صدر باجی کو کرونگی تاکہ اس کھال کے خول اور ہڈیوں
کے مالا کو دیکھ کر.....“

پروفیسر۔ تم کو میرے معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔

دردانہ۔ سچی بات کر دی معلوم ہوتی ہے۔

بیگم۔ حق کیوں نہیں ہے! کیا میرا کوئی اور بیٹھا ہے۔ اکیلا پا کر شیر ہو گئے!

دردانہ۔ میں صدقے ہو کر تمہارے اوپر سے مر جاؤں باجی! تمہاری فکر میں گھلی جاتی ہوں۔

پروفیسر۔ پھر کیوں نہ خان بہادر سے شادی کرادی۔ تم ہی پیش پیش رہتی تھیں اور مجھے اکسایا کرتی تھیں کہ —

دردانہ۔ یہ بھی برائی ہو گئی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ ایسے بدن جانینگے۔ پروفیسر۔ مجھے پھنسا دیا۔

بیگم۔ یعنی؟

پروفیسر۔ مجھ کو ہندوستانی زبان درازی کا نسا کرت بناؤ۔

بیگم۔ میں سمجھی جو تمہارا مطلب ہے۔

پروفیسر۔ پھر کیوں انجان بن کر لوچھ رہی ہو۔

بیگم۔ افسوس! میری قربانیاں بیکار گئیں۔ میں نے اس شخص کیلئے

جائداد پر لات ماری۔ دولت کو ٹھکرایا اور حکومت سے منہ موڑ لیا۔ کاش

میرے وہی دن پھر واپس آجائیں۔ آہ، مجھ کو کیا معلوم تھا کہ مجھے پٹی ہوئی قمیضیں سینا پرینگی۔

دُر دانہ - ہاہ - (آنسو نکالنے کے لئے قریب رکھی ہوئی مرج آنکھوں سے لگاتی ہے)
ریحانہ ہنسی کو روکنے کیلئے رومال منہ پر رکھتی ہے)

پروفیسر - خدا کی قسم تمہاری قربانیوں کی داستان سنتے سنتے عاجز ہو
ہوں (بیانی ٹپک کر) کیا میں نے تمہارے ساتھ شادی کر کے اپنے پاؤں
میں کلھاری نہیں ماری - ارے میں کج گور نہ ہوتا - نواب چھتاری - سر محمد
عثمان اور سکندر حیات خاں کی طرح -

بیگم - شیخ چلی -

پروفیسر - میری ذہانت، ذکاوت اور عقلمندی کا سکہ سارے خاندان
پر بٹھایا ہوا تھا میرے شخص کمنا تھا کہ میں بہت ترقی کرونگا - کیوں ریحانہ بولتی کیوں
نہیں ہو - آج میں گور نہ ہوتا یا نہیں؟

ریحانہ - اس میں بھی کوئی شک ہے - میں کہتی ہوں کہ آپ کی گورنری
اس شان کی رہتی کہ لوگ واجد علی شاہ کی حکومت کو بھول جاتے - آپ جس
وقت بی - اے پاس ہوئے ہیں اُس وقت شہر کے بڑے بڑے رئیس آپ کو
ایک ہاتھ سے لڑکیاں دینے پر تیار تھے اور دوسرے ہاتھ سے دولت،
انریبل سر..... آپ کے پیچھے پیچھے اپنی لڑکی کی تصویر لئے پھرتے
تھے - (ہنسی کے روکنے کے لئے کھانتی ہے)

پروفیسر - ہاں مجھ کو انگلینڈ بھیج رہے تھے، بیرٹری کی تعلیم کیلئے

ہائے ہائے، وہ زمانہ ایسا نہیں تھا کہ بی۔ اے۔ پاس تثنہ ملازمت رہیں
اس وقت میں اگر آئی۔ سی۔ ایس۔ میں بیٹھتا تو ساری سلطنت برطانیہ میں
اول نمبر آتا۔ شان سے ڈپٹی کمشنری کرتا اور چند سال کے بعد گورنر بنا
دیا جاتا۔ تقدیر نے کہاں جا کر دھوکہ دیا ہے۔ آج ہندوستان کو حقوق مل
رہے ہیں۔ اس موقع پر نہ ہوا میں ورنہ واسرائے ہونے کا نمبر
میرا ہی تھا۔

ریحانہ۔ آپ پر اس وقت شادی کا جن سوار تھا۔ بیچیا میں تو کتنا چاہتی
تھی کہ تم ولایت جاؤ۔ مگر کسی سے کہہ نہ سکتی تھی کیونکہ میری کون سنتا۔ اپنی قسمت
ہی میں نہ تھا کہ گورنر کی بہن کہلائے جاتے۔ آہ۔

بیگم۔ ابھی آنکھ نہیں کھلی شاید۔ ہزار کیلنسی سر محمد محمود صاحب۔ ایم
بی۔ اے۔ وائی۔ ایچس دام اقبالہم!۔ میان دن رات قبض کے مرض میں
گرفتار رہتے ہیں اسی منہ سے واسرائے ہوتے۔

وردانہ۔ خالی ذہانت کس کام کی۔ جب تندرستی ہی نہ ہوئی۔
بیگم۔ خالی خولی ایک سٹریٹیکٹ پر اترائے جاتے ہیں تمہارے ایسے
ہزاروں بی۔ اے پاس سیٹھ بہاری لعل کو نسلی کے پاس ناک رگڑنے جلتے
ہیں۔ اچھا یہ بھی سہی کہ تم گورنر ہو جلتے تو میں عرشی کو دہلی کی اسمبلی کا صدر بناتی
جس سے گورنر تو گورنر واسرائے تک خوف کھاتے۔

پروفیسر۔ عرشی کو؟

بیگم۔ ہاں اور کیا تم کو؟ وہ اپنے گھر کا رئیس ہے اور ایک بڑے کارخانہ کا مالک، میں اگر پردہ ترک کر دیتی اور پبلک میں کھڑے ہو کر لکچر دیتی تو کس کی مجال تھی کہ وہ کسی دوسرے کو ووٹ دیدیتا۔ تم خود اس بات کو مانتے ہو کہ ولایت میں عورتیں ہی اپنے خاوندوں کو پارلیمنٹ میں پہنچا دیتی ہیں۔

پروفیسر۔ جاہل محض، جسے دستخط کرنا بھی نہیں آتا وہ دہلی کی اسمبلی کا صدر ہوتا۔

دردانہ۔ اے پڑھ لیتے۔ انگریزی بول لینا لو ہے کے چنے تو ہیں نہیں، پروفیسر۔ خبر یہ بھی مانا لیکن اگر میں گورنر ہوتا تو اس کو انگریز پارٹی سے تعلق رکھنے کی بنا پر جیل بھجوا دیتا رہ جاتی سب صدارت۔

بیگم۔ (سرپیٹ کر) ہے ہے اتنا ظلم، مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اتنے سنگدل ہو۔

پروفیسر۔ خیر، اگر تم خوشامد کرتیں تو ان کو رہا کر دیتا اور محض تمہارے خیال سے کہ چلو بھی چچا کی لڑکی ہے ان کو آزیری مجسٹریٹ کر دیتا۔ یا کسی دُور دراز کے معمولی ضلع میں ڈپٹی کلکٹر۔

بیگم۔ معمولی ضلع کا اور وہ بھی دور دراز۔

پروفیسر۔ اچھا بھئی بریلی کا۔ زیادہ مہربانی کرتا اگر۔

بیگم۔ (آنکھیں پھاڑ کر) بریلی۔ ارے بریلی میں کیا رکھا ہے۔ سوائے ہاشم کے
سُرے اور مدو کے تخت کے۔ میں تو ایسی جگہ کبھی بھی نہ رہتی۔

پروفیسر۔ خیر پہلی بھیت سہی۔

بیگم۔ کالی، پیلی، پیلی بھیت، وہاں رہنے والوں کے نیلے ہاتھ پیر۔

پروفیسر۔ میں اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا تھا۔

بیگم۔ میں تو لکھنؤ کی ڈپٹی کلکٹر رہی لیتی۔ وہاں تعلقداروں اور

نوابوں کی سیکیوں کے ساتھ لطف صحبت رہتا۔ شام اودھ کے نظارے رہتے اور بابا
کی شیرینی اور حلاوت کے لطف۔

پروفیسر۔ (غصہ میں) میں کبھی ہرگز لکھنؤ نہ دیتا۔ وہاں میں خود رہتا۔

بیگم۔ تمہیں لکھنؤ دینا پڑتا۔

پروفیسر۔ میں نے ایک بار کہہ دیا کہ میں لکھنؤ کبھی نہ دیتا۔ زیادہ ضد

اچھی نہیں ہوتی ہے۔

بیگم۔ (سر پیٹ کر) ارے تمہارے زمین دیتی۔ کیا چچیرے بھائی اور منوں

کا اتنا بھی حق نہ تھا ہے خون سفید ہو گیا۔ خدا کی قسم میں دائسرا کے

تک پہنچتی۔ اور اس کی بیگم سے مل کر لکھنؤ کا تبادلہ کر لیتی۔ ورنہ تمہارے

خلاف جلسے کراتی۔ اخباروں میں اشتہار دلاتی۔ اور تمہارے خلاف ایک

بمب بنانے کا کارخانہ کھلوا دیتی۔

پروفیسر۔ (کھڑے ہو کر) بندہ ان گیدڑ بھکیوں میں نہیں آتا۔ فرض اور حکومت کے معاملہ میں عزیز داری کا خیال کرنا عبث ہے۔ میں دنیا کے سلسلے کی ایک اور انصاف کی ایک اعلیٰ مثال قائم کرنے کے لئے عرشی کو کالے پانی بچھا دیتا جاؤ۔
 اوہو میرے تمام دانت نکل پڑے۔

بیگم۔ (روتے ہوئے) یہ مارا ستین ہے۔ بس حد ہو گئی۔ ہم کو کالے پانی بھینچا رہا ہے۔ آہ دنیا سے انصاف اٹھ چکا ہے۔

[دردانہ اور رنجانہ حائل ہونے کے بجائے کمرے میں سے اٹھ کر
 چلی جاتی ہیں۔ لڑائی خوب ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ دونوں
 بیدم ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ خوب روتے ہیں اور بغیر کھانکائے
 سو جاتے ہیں۔]۔

(عصمت)

انحوش فطرت میں

میرے ایک ہندو دوست قبض کے مرض میں مبتلا ہو گئے۔ اور اس کے بعد
دواؤں کے خیال میں مگر ۶

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔

آخر کار فطری علاج کی طرف مائل ہوئے اور امریکہ فزیکیل کلچر میگزین کے ایڈیٹر
میکھڈن سے رجوع کیا۔ اس نے تندرستی اور صحت کے اصول پر بارہ جلدوں
کی ایک ضخیم فائوسن بھیج دی جسے پڑھنے کے لئے ان کو ایک سال کی مدت
درکار ہوئی۔ اب ان کی یہ حالت ہو گئی کہ رگ، پٹھے اور جوڑوں کی تشریح
میں ماہر ہو گئے۔ لیکن اس مزید عرق ریزی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرض نے جڑ پکڑ لی۔ آخر کار
نایوس ہو کر میرے پاس آئے۔ میں نے ان سے کہا کہ میاں تندرستی کے اصول تو
بہت سیدھے سادے ہیں اور فطرت نے تم کو سکھلا بھی دیئے ہیں مگر افسوس ہے
کہ تم ان کو فلسفہ اور سائنس میں تلاش کرتے پھرتے ہو۔

کہنے لگے تم بھی فطرت کی طرح ستم ظریفی کر رہے ہو۔ میں غذا تول کر کھاتا ہوں
گلاس ناپ کر پانی پیتا ہوں۔ گھڑی کے حساب سے سوتا ہوں۔ اور الفاظ گن کر

بولتا ہوں۔ خیالات کو پاک رکھنے کے لئے آنکھوں پر سیاہ عینک لگا کر راستہ چلتا
 ہوں۔ تاکہ تمام حسین چہرے سیاہ روئے نظر آئیں۔ قوت کو برقرار رکھنے کے لئے
 بیوی کو طلاق دیدی ہے اور نوکری کو استعفیٰ دی چکا ہوں۔ مزید براں تازہ ہوا
 کی آمدورفت کے لئے میں نے مکان کی چھت اتار دی ہے اور دیواریں منہدم
 کرادی ہیں۔ جراثیم کو ہلاک کرنے کیلئے سپرٹ کے ٹب میں غوطہ لگاتا ہوں
 اور فیनाٹل سے دیواروں کو معطر رکھتا ہوں۔ چھوت کے مسئلہ پر اس حد تک
 اعتقا درکھتا ہوں کہ میرے دوست مجھ کو اچھوت خیال کرتے ہیں اور میں ان
 کو۔ یہی وجہ ہے کہ میں جو ماما گاندھی کے پرستاروں میں تھا۔ اب ان کے
 مخالفین میں سے ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ان کا وجود سوسائٹی کی تہذیب کیلئے
 پیگ کے کیڑے کی طرح خطرناک ہو رہا ہے۔ بہر حال میں اشد ضرورت پر
 ہاتھوں میں ربڑ کے دستلے پہن کر شیک ہینڈ کرتا ہوں اور سال میں ہولی کے
 موقع پر صرف ایک مرتبہ چند آدمیوں کے گلے مل لیتا ہوں۔ وہ بھی اس طرح،
 کہ میرے منہ کے اوپر اسٹریلایزڈ جالی لگی رہتی ہے اور وہ دوست بھی مخصوص ہتھو
 ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر حکیم، عطار اور کمپنڈر۔ لیکن باوجود ان تمام تدابیر
 کے میں کمزور ہوں اور مرض زوردار۔ اب عاجز آگرمیں نے مصمم ارادہ کر لیا
 ہے کہ "ارلین کلہ برلن" کے سکریٹری کی طرف رجوع کروں تاکہ وہ مجھے
 "برٹنگ" کے نوڈ پر لسٹریٹیکچر روانہ کرے۔ اتنا سرمایہ میرے پاس نہیں کہ میں

ہنس کر کہنے لگے کہ۔ ”اول تو یہ کوئی مذہبی مسئلہ نہیں ہے۔ سڑکوں پر نیم برہنگی کے مظاہرے تو اب بھی ہوا کرتے ہیں جو کئی برہنگی کے مقابلہ میں زیادہ زہد شکن ہیں۔ آستین، گریبان، پلو اور پانچا کے پانچے بے نقود ہو چکے ہیں اور فی زمانہ لباس کی حیثیت مرکزی رہ گئی ہے اور اس طرح ہمارے منزل مقصود تک پہنچنے کیلئے بہت سی آسانیاں مہیا ہو چکی ہیں۔ رہ گئی، مخالفت۔ مخالفت کے نقطہ نظر سے تو جناب آپ مجھے اتنا عرض کرنے دیجئے کہ مسلمان باجے کی مخالفت کرتے آئے ہیں اور ہندو گوشت کی لیکن یہ متاثر ہوتے ہیں اور نہ وہ۔“

”کیا سانسٹی گروہ بھی خاموش رہیگا؟“

”سانسٹی گروہ اگر وادیا مچائیگا بھی تو کیا کر لیگا۔ مذہبی حیثیت سے خاموش ہونا پڑیگا اور سماجی نقطہ نظر سے پسپا۔ کیونکہ وہ لوگ تو بدھوا بواہ، سیول میرج اور جمانا گاندھی کے اچھوت سدھار سکیم کی مخالفت کرتے چلے آئے ہیں۔“

”مگر ہمارے جذبات کا کیا حشر ہوگا اور مسلمانوں کے جذبات کا خون کس کی گردن پر ہوگا؟“

”چوخش،۔۔۔ آپ پردہ کی مخالفت بھی اسی بنا پر کیا کرتے ہیں۔ بھائی رفته عادت ہو جائیگی۔ اس کے علاوہ آپ مجھے بتلائیے کہ آپ امریکہ کی فلمیں کیوں دیکھا کرتے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ ہر سینما گھر میں اکثریت مسلمانوں ہی کی ہوتی ہے جہاں جذبات کا قتل عام ہوتا ہے۔۔۔ بہر حال ہم آپ کی ہمدردی حاصل کرنے

کے لئے اس حد تک تیار ہیں کہ یورپ کے مرتب کئے ہوئے دستورِ عمل میں تھوڑی سی ترمیم کر دیں گے۔

”یعنی؟“

”لباس کی حدود متعین کر دی جائیگی اور اس متعینہ پیمائش سے زیادہ متجاوز ہونے کا کسی کو حق نہ دیا جائیگا۔“

”ورنہ!“

”ممبری سے اخراج۔“

”اس کی کیا صورت اختیار کی جائیگی؟“

”چند ممبروں کے پاس ایک اسکیل رہا کر گیا جس کے ایک طرف اپنیں اور دوسری طرف سینیٹیئر کے نشانات ہونگے — یہی ہماری پولیس ہوگی جو کلب کے اصول کی حفاظت کا اہم مقصد انجام دیگی۔“

”آپ اپنے اپنے کلب کے لئے کونسا مقام تجویز کیا ہے؟“

”ایسا مقام جو ہندوستان میں سب سے زیادہ ہندو ہو اور وہ میر خیال میں ممبئی ہے۔ یہاں ہم کو پارسیوں سے دامے، درمے، قدمے، سختے، مدد ملیگی اور ہماری سکیم بہت جلد بار آور ہو جائیگی۔“

”آپ ممبئی ہی میں اس کا پروپنڈا کیوں نہیں کرتے؟“

”صرف اس لئے کہ ہندوستان کے دارالسلطنت دہلی ہی میں ہم اس کی

ابتداء کرنا چاہتے ہیں کہ اگر مجلس قانون ساز کے اراکین میں سے چند لوگ ہمارے شریک ہو جائیں تو ہمارا بل پاس ہو جائیگا۔“

”آپ خود عملاً اس کا پرچار کیوں نہیں کرتے؟“
 ”چونکہ میرے قوی بہت کمزور ہیں اس لئے میں پبلک اور پولیس کے ذمہ داروں کا تحنہ مشق بننا پسند نہیں کرتا۔“
 ”مگر میں آپ کی مدد کیا کر سکتا ہوں؟“

”اگر آپ قبض کے مریض ہیں تو میرے ہم خیال بن جائیے۔“
 اس موقع پر پہونچ کر مجھے مصلحت آمیز جھوٹ بولنا پڑا۔ واقعہ تو یہ ہے کہ میں کبھی کبھی متنبلا ہو جاتا ہوں اور میں کیا — شیکسپیر کے قول کے مطابق کہ ”ہر وہ دوسرا آدمی جس سے میری ملاقات ہوئی ایک دل پھینک عاشق تھا۔“ میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ ”ہر وہ تعلیم یافتہ جس سے میری ملاقات ہوئی قبض کا مریض تھا۔“ لیکن چونکہ میں ہرگز ہرگز ان کی رائے سے متفق نہیں ہو سکتا تھا اس لئے میں نے ان سے کہا کہ

”میں خدا نخواستہ اس مرض کا مریض نہیں ہوں۔“
 کہنے لگے۔ ”اگر اب نہیں تو ہو جائیگے۔“

میں نے کہا کہ ”پھر دیکھا جائیگا۔“
 آخر کار انھوں نے مجھ کو اپنی دوستی کا واسطہ دلاتے ہوئے استدعا کی کہ

میں دہلی کے کسی اہم اور کثیر الاشاعت رسالہ کے ذریعہ قبض کے مریضوں کی مردم
 شماری کی تحریک پیش کروں۔ چونکہ اس میں ظاہر کنسی خطے کا امکان نہیں اس
 لئے میں ایڈیٹر شاہجہاں سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ اس مسئلہ پر اپنے ناظرین
 ریسرچ کرنے کی تحریک پیش کریں۔ آخر میں میں علی الاعلان عرض کرتا ہوں کہ
 مجھے ”برہنہ کلب“ سے نہ تو کسی قسم کا سروکار ہے، نہ رہا ہے اور نہ آئندہ رہنے کی
 امید ہے۔ اس لئے میں اس مسئلہ پر بحث و تجویس میں حصہ لینے سے محترز رہوں گا۔

(شاہجہاں)

پان کار

نوٹ :- سنسکرت میں آرٹسٹ کو روپ کار کہتے ہیں جس کا درجہ ایک بازار میں مصو سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ اسی طرح پان بنانے والے کو آرٹ کے نقطہ نظر سے پان کار کہنا نہ تو ادبی غلطی ہے نہ فنی۔ البتہ پرواڑی اور تبنولی سے میز کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کا جواب ذیل کا مضمون دیکھا۔

ہندوستانیوں کے محبوب ترین مشغلے دو ہیں۔ پان اور شعر، اول الذکر مخصوص طریقے سے جنس لطیف کا مہر ہون منت اور آخر الذکر جنس قوی کی تخلیق۔ پان کا مراد اور شعر کہنے والی عورتیں مستثنیات سے ہیں۔

حالی اور اسماعیل میرٹھی نے شعر اور مشاعروں کی بھرمار کے خلاف صدا احتجاج بلند کی تھی۔ لیکن پان اور پان دان کے خلاف تمام نوجوان طبقہ کمر بستہ ہے جن میں ایک ہماری ذات ہی مستثنیٰ ہے۔

دراصل پان کی تعریف میں قصید کہے جاسکتے ہیں لیکن جو چیز کہ اس کے خصائص پر عیوب کا پردہ ڈالے ہوئے ہے وہ اس کی سرخ چمککاری ہے جس نے اس کو داغدار بنا دیا ہے۔ مگر حافظ کہہ چکے ہیں۔ ۷

مے کہ بدنام کُن د اہل خرد را غلط است

بلکہ نر میشود از صحبت ناداں بدنام

یہی شعر برگ تمبول کے مخالفین کیلئے جواب مسکت کا کام دے سکتا ہے۔

حقائق میں نظروں کے لئے شعرا و رپان دو جدا گانہ چیزیں نہیں بلکہ جذبات

کے نقطہ نظر سے پان شعر ہے اور شعرا پان۔ ظاہری صورت میں بھی ان دونوں

میں ایک قسم کی مشابہت پائی جاتی ہے۔ جس طرح شعر کے لئے ردیف اور قافیہ

کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح پان کے لئے کتھے اور چونے کی۔ وزن کے لحاظ سے

ان دونوں اجزا کا تناسب بھی بحد ضروری ہے ورنہ شعر تقطیع سے آزاد ہو جائیگا۔

اور پان ذائقہ سے۔ یہ امر ملحوظ خاطر رہے کہ آدھا پان جس کو عرف عام میں

کتر کہتے ہیں دراصل مکمل شعر نہیں بلکہ ایک مصرعہ کہا جاسکتا ہے۔

جس طرح شعر محاکات سے آزاد ہو کر بھی اپنی مخصوص بحر سے آزاد نہیں ہوتا

اسی طرح پان کی زمین بھی اپنے لوازمات سے علیحدہ ہو کر ایک خاص بحر کے تحت

رہتی ہے اور یہ دراصل اس کا فطری ذائقہ ہے۔ مدراسی۔ بنگلہ۔ بنگلی۔ پونوی

وغیرہ خاص خاص ماحول کے لحاظ سے جدا گانہ بحر کے مالک ہیں۔

اب رہا شعر کا ترنم سو وہ بھی پان میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ اور یہ اس کی

ذائقہ نوازی اور لبوں کی سرخی ہے جو بیک وقت باصرہ نوازی کا مقصد بھی

انجام دیتی ہے۔ گویا پان کے اندر شعر کے وجدان کے شانہ بشانہ مصوری اور موسیقی

کے تاثرات بھی موجود ہیں اور اس طرح پان آرٹ کی جملہ اصناف کا مکمل نمونہ کہا جاسکتا ہے۔

شعر کے نقطہ نظر سے لاپچی۔ تمباکو۔ اور ڈلی زواید تو نہیں کہے جاسکتے لیکن لوازمات کی صف میں بھی شمار نہیں کئے جاسکتے۔ ناریل۔ چکنی ڈلی۔ سونف۔ زیرہ اور دوسری قسم کی تپیاں دراصل حشو زائد ہیں جو شعر کی صف سے نکال کر پان کو معر بنادیتی ہیں۔ اور واقعی ایسے لوگ مذاق سلیم کی گردن پر چھری پھیرنے کے ملزم قرار دیئے جاسکتے ہیں۔ وہ دراصل پان نہیں کھاتے بلکہ پان کا مرثیہ بٹھتے ہیں۔ ان زواید کی ایجاد کا سرہ اہل مداس اور مہبئی کے سر ہے۔ بہتر ہوتا کہ وہ ”یونانی دوا خانہ دہلی“ سے برگ سناہلی اس میں اور شامل کرالیتے۔ تاکہ اس ”تیلین نسخہ“ کے اجزاء مکمل ہو جاتے۔

آخر میں محاکات شعر کے ضمن میں وہ چیز رہ جاتی ہے۔ جو دراصل شعر کی ہجو ہے۔ اور جس کے پردہ میں شاعر کی دلی کیفیات کا موجیں مارتا ہوا سمندر ستہیں۔ یا ناظرین کو ایک زبردست وجدانی رو کے ساتھ بہلے جاتا ہے۔ یہی روح پان کا عطر ہے جو غمِ اینِ سعادت بزورِ بازو نیست، کے مصداق ہر پان میں نہیں پائی جاتی۔

جس طرح ہزنک بند شاعر اور ہر بوا لہوس عاشق نہیں بن سکتا۔ اسی طرح ہر صاحبِ پاندان ”پان کار“ بھی نہیں کھلایا جاسکتا۔ اس مقام پر یہ ممکن ہے کہ بعض

اہل ذائقہ نیوٹرن اور تینولن کو پیش کریں۔ میں ان کی خدمت میں بعد ادب عرض کروں گا کہ خدا کے لئے اس امر کو نظر انداز نہ کیجئے کہ پان اپنے جسم میں شہریت رکھنے کے علاوہ ایک دوشیزہ کی طرح عفت و عصمت کا حامل بھی ہے۔ جس کی تلاش کیلئے دوکان اور بازار کا چکر لگانا اس کی ذلت و حقیر کرنا ہے۔

اسی ضمن میں نیوٹرن اور تینولن کا ایک لطیف فرق بھی ملحوظ خاطر رہے، اول الذکر صرف سادے پان فروخت کرتی ہے۔ اس کی حیثیت ایک پان کار کے مقابلے میں بالکل ایسی ہی ہے جیسے اقبال کے سامنے کسی پیرل کے اکھنٹ کی یا کسی حسین دوشیزہ کے سامنے قنوج اور لکھنؤ کے عطر کے کارخانوں کی تینولن دراصل بنے ہوئے پان فروخت کرتی ہے۔ لیکن ان کا درجہ ایسا ہی ہے جیسا غالب کے کسی اعلیٰ شعر کے سامنے ”چنے جو گرم لایا ملائم مجیدار“ کا۔ نہ صرف یہی بلکہ وہ انہیں کے ساتھ اپنی عفت و عصمت بھی بازار میں لے آتی ہے۔

پان کا لطف اٹھانے کے لئے دانت اور زبان کی ضرورت نہیں بلکہ دل کی ضرورت ہے۔ مارواری کی تھیلی کی طرح کلمہ دان میں اس کی لبدی اس طرح نہ رکھی جائے کہ آپریشن کی نوبت آئے۔ اس کے برخلاف پان کھایا چایا نہیں جاسکتا۔ چنول اور جواری کی طرح، بلکہ محلول کیا جاتا ہے خون میں اجزاء، اجزاء، رنگ بہ رنگ تا آنکہ لہو میں کر جذبات سمیت روح میں تحلیل ہو جائے۔ اس کی سرخی کو بیڑی کی شکل میں باچھوں تک لے آنا گویا پان کو شہید کرنا ہے

پڑائے ہوئے ہونٹ ہنگامہ خیز قہقہے کے مترادف ہیں جن سے چہرہ کی ہنیت کدلی
بربریت کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ زیر لب تبسم، چشم نیم باز، نیم وا چہرہ اور ہلکے گلابی
ہونٹ تاثرات کے لحاظ سے قیامت ہیں اور ہنگامہ تبسم،

پانوں کی تھالی میرے لئے ایک بزم شاعر ہے جن میں پانوں کی گلابی
الوع واقسام کی نظموں کی سی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ مجھ کو اپنے لطیف اجسام
کی کشش سے خود پر اس طرح مائل کر لیتی ہیں کہ میں ایک گلوری کے عوض
عمر خیام کے چھلکتے ہوئے جام اور حافظؔ کے ”خال مہندو“ کی کوئی
حقیقت نہیں سمجھتا۔

میرے نقطہ نظر سے ہندوستان میں تہذیب و تمدن کا معیار کوئی
اور شے ہو ہی نہیں سکتی مگر پان، مہذب شخص وہ کہلائے جانے کا مستحق ہے
جو پان سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت و اہلیت رکھتا ہو اور پان کاروں
کی ہمت افزائی کرنا جانتا ہو۔

اس فن لطیف کو لطیف تر بنانے کا سہرا جیسا کہ میں شروع میں اشارۃً
کہہ چکا ہوں جنس لطیف کے سر ہے اور اس کے ارتقا میں سہولتیں مہیا کرنا
ہم مردوں کا فرض۔ افسوس ہے کہ ہندوستانی موسیقی، شاعری اور مصوری
جیسے فنون لطیفہ کے انحطاط کے ساتھ ساتھ اس کا انحطاط بھی ہو رہا ہے اگرچہ
تہذیب جہاں ہندوستان میں گریٹ کو بیچان کے مقابلہ میں سلگایا ہے

اسی ضمن میں لبوں کی مصنوعی سُرخی سے پان کو مات دی ہے۔ یہاں تک کہ آخر اندر کا رنگ بالکل پھیکا پڑ گیا ہے۔ یہ وہ اس حد تک تر مٹی کر گئی ہے کہ میری تختہ سرنے بھی پان دان کو باورچی خانہ میں لیجا کر نمک، پرچ اور گرم صابن کی ہانڈی بنا دیا ہے اور اس کے بجائے غارے اور سرخی کی شیشیوں پر اپنی تمام توجہ مخطوف کر دی ہے۔ میں آپ سے پرزور اپیل کرتا ہوں کہ آپ اس فن قدیم کو برباد ہوتے دیکھ کر میرے ہم آہنگ ہونگے اور لبوں کی سرخی کے خلاف حتی المقدور کوشش بلیغ فرمائیں گے۔

ہندوستان میں اس دور انحطاط میں بھی کشتہ سے ایسے خاندان ہیں جو پان سے شوق رکھتے ہیں اور اس فن کو باقی رکھنے کا ذوق۔ لیکن ان کی حیثیت ایک نادان دوست کی سی ہے۔ انھوں نے جس طرح فن شاعری کو گل و بلبل کے افسانوں میں محدود کر دیا ہے۔ مصوری کو کلبنڈر کی تصویروں میں مقید اور موسیقی کو ہارمونیم کی الاپ میں منتقل کر لیا ہے۔ اسی طرح پان کو مغویہ اور پچکاری بنا لیا ہے۔ بکری کی طرح جگالی کرنا۔ بطخ کی طرح ہونٹھوں کو اس کے لعاب سے لودہ کرنا۔ مرغی کی طرح درو دیوار کو داغدار بنانا اور خود کے اور دوسروں کے لباس پر گلکاری کرنا دراصل ہندوستانی تہذیب کا گلا گھونٹنا ہے۔ ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ زمانہ قدیم کی مٹل اور چاندنی عصمت کاب تھی اور گا لداں عیب پوش۔

گوشت خورہ کی فراوانی بھی اُس کے خلاف ایک زبردست ہتھیار ہے۔
 کاشتکہ دانتوں کا کوئی دھگل منعقد کیا جاتا تو فوراً معلوم ہو جاتا کہ کس کی ہڈی مضبوط
 ہے دانتوں کی جڑیں سرخ پانی سے مضبوط ہوتی ہیں۔ ان کا معدہ دلی کے ٹکڑوں کے
 پینے سے طاقتور اور ان کے جراثیم چونے کے انجکشن سے ہلاک۔ البتہ اگر چونے
 کی ڈلیوں کو لعاب دہن میں بچھاؤ دیئے جائیں اور کتھے کے رنگ کی آمیزش
 سے دانتوں پر متواتر پلاسٹر چڑھائے جائیں تو اس کیمیاوی عمل سے
 جو کچھ نتیجہ ہو گا وہ ظاہر ہے۔

بہر حال یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ لیکن جس طرح شعر کہنے اور شعر پڑھنے میں فرق
 ہے اسی طرح پان بنانے اور پان کھانے میں بھی فرق ہے۔ پان کاری کا فن
 سینہ بسینہ ہر ماں سے لڑکی تک بطور ورثہ پہنچتا ہے۔ ہندوستان میں
 معدودے چند ایسے خاندان ہیں جو اس کی متدبیری خصوصیات کو برقرار
 رکھنے میں کوشاں ہیں۔

مثلاً ڈلی ہی کے سسے کو لے لیجئے۔ اس کا کترناکیل نہیں ہے۔ ہم نے جب
 کبھی کوشش کی انگلی کو شہید کر لیا۔ کیونکہ ہمارے ہاتھ میں سروتہ اور عورتوں
 کے ہاتھ میں استرہ خطرناک صورت اختیار کر لیتا ہے۔ عورتوں کے لئے مخصوص
 طریقہ سے سروتہ کا شغل بچہ دیکھ سہ ہے اور مفید، رات کے گہرے سکوت میں
 جب تمام عالم محو خواب ہو تو سروتہ کے تال کی آوازیں موسیقی کا لطف

دیتی ہیں۔ جس طرح سگریٹ کے دھوئیں کے پیچ و خم میں ہم مضامین کے جلوؤں کی پاشانی دیکھتے ہیں۔ اسی طرح عورتیں اس کی آوازیں ایک خاص رومانی کشش محسوس کرتی ہیں۔ اور اکثر ان اوقات میں خاموش بیٹھ کر کسی دوسرے عالم میں پہنچ جاتی ہیں۔

غرض کہ سروۂ خلوت میں ان کاموں سے اور خلوت میں ان کا ہم جلیبجہ لیکن اگر دس پانچ سرتوں ایک مقام پر مجتمع ہو جائیں تو ایک قسم کا ہنگامہ برپا کر دیتے ہیں اور یہ پان بنانے کا کارخانہ مصیبت عظمیٰ بن جاتا ہے۔ میرے ایک دوست کی محترمہ جب اپنے شوہر سے ستیہ گرہ کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہیں تو مکان میں ڈلی کاٹنے کی ایک مجلس منعقد کر دیتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ میرے دوست یا تورات بھر کر وٹیں بدلتے رہتے ہیں اور یا اعتراف گناہ کر کے قصور معاف کرا لیتے ہیں۔

خیر ڈلی کی خصوصیت صرف یہی ہے کہ اس کے تمام دانے ساچھے میٹھے ہوئے ہوں اور ہیروں کی طرح ترشے ہوئے۔ اگر ان کو کبوتروں کے سامنے ڈال دیا جائے تو وہ بے اختیار ان پر چھپٹ پڑیں۔ ورنہ بد صورت ڈلی کے بد قوام اور نامکمل ٹکڑے سڑکوں کے کنارے کنکر توڑنے والے مزدور بہت ہوشیاری سے توڑ سکتے ہیں۔

آخر میں اتنا عرض کرنے کی جرات کروں گا کہ جو لوگ عمر بھر پان کھاتے ہیں

مگر پان بنانا نہیں جانتے اُن میں یقیناً شے لطیف کی کمی ہے ان کی مثال اس شخص کی طرح ہے جو کھنڈ میں کربھی نسخہ کو غصہ سے اور مزاج کو مجاز -

عموماً پان پیش کرنے کے دو طریقے ہیں۔ پانداں یا کشتی مہمان کے سامنے اس طرح پیش کر دینا کہ وہ دست خود، وہاں خود کے اصول پر خود ہی ڈلی کترے خود ہی پان کے رگ دریشہ صاف کرے اور خود ہی کتھے چونے کی آمیزش کرے۔ وہی حیثیت رکھتا ہے جس طرح دسترخوان پر بریانی کے پلیٹ رکھنے کے بجائے چاول، گوشت، گھی اور گرم مصالحہ علیحدہ علیحدہ رکھ دیا جائے اور فرمائش کی جائے کہ حسب مرضی خود ہی پکا بھی لے۔ یقیناً پان کے ذائقہ کا معیار جداگانہ ہے۔ اسی طرح غذا کے ذائقہ کا معیار بھی جداگانہ ہے۔ یہ امر میرزا کی صلاحیت اور ادراک پر مبنی ہے کہ وہ کھانے میں نمک تیز کرنے اور پان میں چُونہ -

دوسرا طریقہ بنے ہوئے پان پیش کرنے کا ہے اس کے مختلف انداز ہیں جن کی صورتیں ذیل میں بیان کی جاتی ہیں۔

اول، کتر۔ اس کو غریب محبت سے پیش کرتا ہے اور امیر حقارت سے اس لئے پہلی صورت میں نگرہ کے ساتھ قبول کر لیتا چاہئے اور دوسری صورت میں قطعی انکار۔

دویم - دوہرا، پان کو موڑ کر ڈلی، تمباکو اور الائچی علیحدہ علیحدہ رکھ دی جاتی ہے۔

یہ صورت بھی مجھ کو ناپسند ہے۔ کیونکہ یہ پیش کرنے کا ایک بھونڈا انداز ہے۔ جس میں آرٹ کو کوئی دخل نہیں۔ اس کی مثال یہی سمجھ لیجئے کہ سالن عمدہ پکایا جائے لیکن پتیلی میں نمک ڈالنے کے بجائے دسترخوان پر لا کر رکھ دیا جائے۔ اصول تو درست ہے۔ لیکن اس کا نتیجہ اچھا نہیں۔

سویک۔ گلوری۔ اس میں ڈلی اور الپچی ڈال کر اس طرح ملفوف کیا جاتا ہے کہ اس کی سطح پر کسی قسم کی سکن نہیں آتی۔ یقیناً یہ بہترین صورت ہے اور فن کے لحاظ سے شاہکار کہتے اور چونے کے میکسچر کی زاید رطوبت کو ڈلی جذب کر لیتی ہے اور اس طرح پان کا ذائقہ بہتر ہو جاتا ہے۔ اس صورت کی تذکیر بیڑا ہے جو کوئی شکل کا ہوتا ہے۔

جس طرح شعر میں آمد اور آمد کے فرق سے انقلاب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح پان بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں۔ پان بنانے کی تحریک اگر بیرونی ہوگی تو اس کا شمار آورد میں ہوگا اس لئے پان کا رکے سامنے ہاتھ مت پھیلاؤ۔ اس فرمائش کا وہی حشر ہوتا ہے جو مصرعہ طرح کا۔ یہی وجہ ہے کہ مجلس کے پان اور شاعرہ کی غزلیں اکثر پھسکی ہوتی ہیں۔

(ساتھی)

مغالطہ

ظاہر طور سے یہ سوال کہ ہم سینما کیوں جاتے ہیں؟ کوئی خاص سمجھت نہیں رکھتا لیکن اس صورت میں جبکہ اس کا ایک سے زیادہ جواب ممکن ہو سکے یہ بھی ایک دلچسپ بحث بن سکتا ہے۔ آپ نے غور فرمایا ہوگا کہ فلسفہ کے ہر بحث کی طرح اس مسئلہ کے بھی دو پہلو ہیں ایک روشن اور دوسرا تاریک۔ مگر ستم ظریفی تو دیکھئے کہ تمام مسئلہ اصولوں کے برخلاف اس کے روشن پہلو پر تاریک پہلو کو ترجیح دیجاتی ہے۔ اگر آپ کو اس کلیہ سے اتفاق نہیں ہے تو اولین فرصت میں جا کر روشنی میں سینما دیکھنے کی مسلسل مشق شروع کر دیجئے۔ لیکن میرے ایک دوست ہیں جو چند خاص اصولوں کی بنا پر اس کلیتہ سے قطعی اختلاف رکھتے ہیں۔ ان کا ساون کی گھنگھور گٹھاؤں اور سینما کی اندھیری دھنوں میں دم گھبراتا ہے۔ ان کو بجلی کی کڑک دمک اور اسکرین کی آب و تاب سر آشوب چشم کی سرکامیت ہو جانے کا احتمال رہتا ہے۔ اسی لئے وہ وقفہ کے چند لمحوں کو چاندنی رات سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اور بعض اوقات اس حد تک کہنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں کہ چاندنی رات کا آسمان پھیکا ہوتا ہے۔ اور

بے رنگ، مگر بہاں کا آسمان شوخ اور رنگ برنگ۔ یہی وجہ ہے کہ سینما کو حسن کی نمائش گاہ خیال کرتے ہیں فلم کی نہیں۔

ہمارے نقطہ نظر سے سینما کی مخصوص فضا میں ہر تماشائی غیر ارادی طور سے ایک فطری اداکار نظر آتا ہے اور اسکرین کی مقناطیسی شخصیتوں کے زیر اثر حزن و اور طرب و ہلاکت پیش کرتا ہے چونکہ اہل کو نقل پر ترجیح دینا کوئی گنا نہیں اسی لئے ہمارا دائرہ تفریح فلم اور حسن کی قید و بند سے آزاد رہتا ہے۔ اکثر اوقات یہ ہنگامی ہلاکت اس قدر مکمل اور مسلسل ہوتا ہے کہ اس کی ہر ایک کڑی گزشتہ سے پیوستہ ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ تماشہ کے اختتام پر ہمارے دماغ میں ایک جیتا جاگتا فلم اتر آتا ہے۔

کل ہی کا واقعہ ہے کہ ایشیا کے بہترین سینما ریکل بمبئی میں اسکرین کے دو ممتاز مسخروں لارل دھارڈی کی فلم کا نظارہ تھا۔ جس کو دیکھنے کیلئے تماشائیوں کا ایک ہجوم تھا۔ اور اسی میں برفع پوش خواتین کی ایک نصف درجن تعداد بھی شامل تھی۔ جن کی خصوصیت یہ تھی کہ ان میں سے ہر ایک چہ نقاب کی بست و کشاد سے آزاد تھا۔

پردہ دار عورتوں کیلئے برفع اور کمزور آنکھوں کے لئے عینک حفاظت کی ٹٹی ضرور ہیں۔ بشرطیکہ اول الذکر میں نقاب ہو اور آخر الذکر میں تال، وگرنہ برفع کا محض گھبرا اور عینک کی محض کمائیاں صرف اسی قابل رہ جاتی ہیں۔ کہ

ایک کے تکیے کے غلاف بند لئے جائیں اور دوسرے کو بچوں کا آلہ تفریح - یہی جو تھی کہ یہ عجیب اخلاقت مخلوق عجائب خانوں کے سنگین تلوں کی طرح ریگل کی آبادی کے لئے "نمائش پر" تھی۔

اسی ضمن میں میری نظر ایک محبوبہ الحواس نوجوان پریٹری جو مکٹ کی کھڑکی سے نکلا چلا آ رہا تھا۔ میرے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب میں نے دیکھا کہ یہ میرا ہم وطن اور ہم جماعت دوست مسعود تھا۔ میں فرط مسرت میں "ہلو" کہہ کر اس کی طرف لپکا ہی تھا کہ وہ میری طرف سے رخ پھیر کر اس طرح کتر کتر نکل گیا کہ جیسے ہاجن کے سامنے خوفزدار۔ مجھ کو اس کے اس طرز عمل پر بے حد حیرت ہوئی لیکن جب میں نے دیکھا کہ وہ صرف تنہا ہی نہیں ہے بلکہ اس کی ہمراہی میں مذکرہ برقع پوش خواتین کا ایک رسالہ بھی ہے۔ تو میں نے اس کو بدل سے معاف کر دیا۔ اور اس کی سلامتی کیلئے خداوند کریم سے دعائیں مانگنے لگا۔ کیونکہ دوستوں سے شان استغبارتے کے تین ہی موقع ہوتے ہیں جو حق بجانب ہیں اور واجب التسلیم۔ اول برقع پوش خواتین کے ساتھ دوسرے موٹر کے اوپر اور تیسرے پولیس کی حراست میں۔

میں مسعود اور اس کے تمام خاندان سے اچھی طرح واقف تھا۔ مجھ کو یہ بھی معلوم تھا کہ اس کے یہاں کی عورتیں عمر میں دوہی مرتبہ گھر کی چار دیواری سے باہر قدم نکالتی ہیں، ایک شادی اور دوسرے موت کے بعد۔ اکثر اوقات جب کہ

شادی ایک ہی گھر میں قرار پا جائے اور قبر کا مکان ہی میں انتظام ہو جائے تو بابر نکلنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ بیماری کے موقعوں پر بصورت مجبوری اگر ڈاکٹر کو نہیں دکھانا ضروری ہوتی تھی۔ تو مرلیضہ اپنے ہاتھوں کو ربر کے موٹے دستانوں سے محفوظ کر لیتی تھی۔ یہی گذشتہ تاریخ تھی کہ جس کی روشنی میں مجھے اس کے یہاں کی خواتین کا ریگل سینما میں برا فکندہ نقاب نظر آنا ایک انقلاب عظیم معلوم ہوا۔



ہال پُر ہونے کے قریب تھا اور تماشہ شروع ہونے والا تھا۔ کہ اسی اتنا ہیں وہی ہلوس اس طرح داخل ہوا کہ ہمارے نوجوان دوست سب آگے آگے نہٹے۔ اور ان کی ہمراہی میں خواتین سنگل فائل میں پیچھے پیچھے۔ ابھی یہ ٹرین پلیٹ فارم میں پوری طرح داخل بھی نہیں ہوئی تھی کہ انھوں نے ایک ہوشیار ڈرائیور کی طرح جولائن کلیر کے بغیر قدم بھی نہیں اٹھاتا۔ رک کر تمام ہال پر ایک سرسری نگاہ ڈالی۔ میں ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھ کر یہی کہہ سکتا ہوں کہ انھوں نے اپنی عمر میں اس سے قبل کبھی اتنا پاکیزہ اور عظیم الشان مجمع نہیں دیکھا تھا۔ اسی لئے ان کی پیشانی پر پسینہ کے بڑے بڑے قطرات نمودار ہو گئے وہ فیصلہ بھی نہ کرنے پائے تھے کہ ان کی جمعیت کثیر کے لئے کون سی جگہ مناسب ہوگی کہ پشت پر سے اندر داخل ہونے والوں کا ایک سیلاب آیا جس سے

ان کے جلوس کے تمام افراد میں ایک اتبڑی پھیل گئی۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح یہ قافلہ آگے بڑھا اور قریب کی چند کرسیوں پر جو خالی پڑی ہوئی تھیں اطمینان کا سنا لیکر قابض ہو گیا۔ لیکن قبضہ مخالفانہ تھا کیونکہ انہوں نے عالم اضطراب میں کرسیوں کے رومال بندھتوں پر نظر نہیں ڈالی تھی۔ چند ہی منٹ کے بعد ایک پارسی خاندان اس سین پر نمودار ہوا اور نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں گروہوں کے ذمہ دار لیڈروں میں ایک پر لطف مکالمہ شروع ہو گیا جس میں حاضرین جلسہ نے خاموشی اور سکوت ہی سے دلچسپی کا اظہار کیا۔ آخر کار سینما کے میجر کو طلب کیا گیا۔ جس نے گزشتہ روایتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے فیصلہ ہمارے قیمت دوست کے خلاف سنا دیا۔

اب ہمارے نوجوان مسافر کے لئے صرف ایک ہی راہ تھی کہ کرسیوں کی اس قطار پر جو سیکنڈ کلاس اور تھرڈ کلاس کے درمیان حد فاصل کا کام کر رہی تھی اور ہماری سیٹ سے دوسرے ہی نمبر پر تھی قہر درویش برجان درویش جا کر بیٹھ گیا۔ آخر کار یہ قافلہ ان خالی کرسیوں کی طرف اس طرح آ رہا تھا کہ تمام حاضرین کی نگاہیں اس عجیب و غریب جلوس کی طرف تھیں۔ گویا الف ایسی کی کہانی کا کوئی عربی سین دکھایا جا رہا تھا۔

برقعوں کے گھیر کی کشاکش، کرسیوں کے درمیان کئی تنگ وسعت اور موجو سین کی نزاکت کی وجہ سے سب کے سب تعیش تو تھے ہی۔ لہذا زمین بوسی کے

کے چند حادثات کے بعد یہ لوگ اپنی منزل مقصود پر سلاہتی سے پہنچ گئے۔ مگر آفتیں تنہا نہیں آتیں۔ اب اس عقل کو کیا کیا جائے کہ کرسیوں پر بیٹھ تو گئے لیکن اس طرح پر کہ قطار کے دونوں سرے خالی چھوڑ دیئے۔

سینا کی خالی کرسی ایک قسم کی (vacancy) اسامی ہوتی ہے جس کی خانہ پری جلد بابر ہو ہی جاتی ہے۔ چنانچہ ایک طرف کی دو خالی کرسیوں پر دو تازہ دم گوراشا ہی جوان اکرجم گئے۔ بد قسمتی سے ہمارے تذکرہ گروہ کی نازک کڑیوں کی ابتدا یہیں سے ہوتی تھی۔ اس لئے گوروں کے قبیلہ سے خائف ہو کر خاتون ۱ نے خاتون ۲ کے کان میں اس حادثہ کی اطلاع دی جنہوں نے خاتون ۳ سے اس واقعہ کو دہرایا۔ انہوں نے خاتون ۴ سے کنکشن جوڑ کر اپنے فرض کو ادا کیا۔ غرض کہ اسی طرح درجہ بدرجہ یہ برقیہ آخری سٹیشن تک پہنچ گیا۔ وہاں سے چند خاص احکامات صادر کئے گئے جو اسی ترتیب کے ماتحت خاتون ۵ تک پہنچا دیئے گئے۔ نتیجہ اس طرح رونما ہوا کہ خاتون ۱ اپنی جگہ پر پکڑی ہو گئیں۔ ان کے اس عمل پر تمام قافلہ نے ترتیب وار ایضاً کیا اور پہلی بد قسمتی کہ یہ لوگ اسکرین کے ایک دھچپ سین پر اس طرح نظر آنے لگے جس طرح، مصوٰر دیوان غالب کے ایک نفیس صفحے پر گاڑھی گاڑھی روشنائی کے بد نما دلغ۔ بیتاب تماشاویوں کو بھلاتا بکھانا۔ انہوں نے ”بیٹھ جاؤ“ کے نعروں سے تمام ہال کو اپنے سر پر اٹھا لیا۔

میرا خیال تھا کہ یہ لوگ سینما کے حدود سے باہر ہی جا کر دم لینے کیلئے انہوں نے آہستہ آہستہ سر کنٹاشرف کیا اور گوری پلٹن کے خطرناک موپے سے ایک کچھ سی کافا صلہ چھوڑ کر دوبارہ مرتب ہو کر بیٹھ گئے۔ اسی اثنا میں ایک نووارد اس خالی جگہ کو دیکھ کر جھپٹا ہی تھا کہ ہمارے دوست نے پیش قدمی کر کے اس کو اپنے لئے محفوظ کر لیا۔ لیکن صورت حال میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ کیونکہ اس شطرنج کی بساط کے لئے دو شاہوں کی ضرورت تھی۔ ایک ہی آدمی دو کمزور کونوں کی حفاظت کس طرح کر سکتا تھا۔؟

سینما کی اندھیری فضا میں نے محسوس کیا کہ دوسری طرف کی کرسیوں کی آبادی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ یہاں تک کہ اس طرف بھی وہی صورت نمودار ہو گئی جو اس طرف ہوئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں میرے کان میں خاتون ملکی کی ایک ہلکی سی چیخ کی آواز سنائی دی۔ لیکن وہ تماشائیوں کے قہقروں کی گونج میں مل کر کھو گئی ورنہ یا تو فارر برگسٹ کو تکلیف ہوتی یا پولیس کے ایک دستہ کو۔ بہر حال اس مخصوص گروہ میں از سر نو تلاطم ہوا۔ زلزلے آئے اور خبروں کا تبادلہ ہوا۔ یہاں تک کہ ہمارا ہبا در میر و جائے واردات پر پہنچا اور تھوڑی سی سرگوشی کرنے کے بعد پھر اپنی جگہ پر واپس آیا لیکن اس طرح کہ کسی پہلو قرار ہی نہ تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ اس نے اپنی گردن کو پیچھے موڑا۔ میں نے سنا کہ اس نے میرا نام لے کر پکارا۔ اس کے بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ اپنی بے بسی

گلوگیر ہوا۔ اس موقع پر مجھ کو اپنے دوست کی تیز نظری کی داد دینا پڑی۔ کیونکہ جس شخص نے مجھ کو بجلی کی طاقتور روشنی میں نہ پہچانا وہی مجھ کو اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں دیکھ رہا ہے۔

میں نے ان کی مصیبت کو گوش دل سے سنا۔ واقعہ یہ تھا کہ وہ محترم جو سب سے آخری سرے پر بیٹھی ہوئی تھیں ان کی قریب کی نشستوں پر کئی فزغلی اگر بیٹھ گئے۔ ان میں سے ایک نے اپنے شانے سے ان کے شانے کو اس طرح خطرناک طریقے پر ٹھوکا دیا کہ ان کو اختلاج قلب شروع ہو گیا۔ لیکن وہ اس قدر کمزور دل کی نہیں ہیں اس لئے انھوں نے محض صبر سے کام لیا۔ اور صرف ایک ہلکی سی چیخ پر اکتفا کی۔ وگرنہ کوئی دوسری خاتون ہوتی تو وہ یقیناً بیہوش ہو جاتی میں سچ عرض کرتا ہوں کہ یہ سن کر میری رگ جمبت پھڑکنے لگی۔ مگر یہی موقع کی نزاکت کا لحاظ کرتے ہوئے ان کو مشورہ دیا کہ وہ ایسا سینما دیکھنے سے باز آئیں جس میں جان اور اکبر و دونوں کا خطرہ ہو۔ اور نہ صرف کچ بلکہ عمر بھر کیلئے ان کو توبہ کر لینا چاہئے کہ وہ ایسے بہادر ساتھیوں کو لے کر کم از کم تفریح کے خیال سے اپنے مکان کی چوکھٹ کے باہر بھی قدم نہ رکھیں۔ لیکن انھوں نے میرے اس نیک مشورہ پر عمل کرنے سے انکار کر دیا اور مجھ کو مجبور کیا کہ میں نسوانی عزت و وقار اور ہندوستانی عصمت و پاکیزگی کو برقرار رکھنے کیلئے اس حادثہ کی اطلاع سینما کے میجر کو دیدوں تاکہ اس سفید موالی کو فوراً باہر نکال دیا جائے۔ میں نے

معاملہ کو رفع دفع کرنے کی خاطر دوبارہ ان کی خدمت میں عرض کیا کہ اس مخصوص جگہ پر کسی بزرگ خاتون کو بٹھا دیجئے یا آپ خود جا کر بیٹھ جائیے۔ مگر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انھوں نے مجھے اطلاع دی کہ بحیثیت ماں ہونے کے سب سے زیادہ بزرگ وہی خاتون ہیں۔ آخر میں انھوں نے میری سپت ہمتی پر ملامت کرتے ہوئے کہا۔ کہ اگر اس موقع پر میری خود عزت کا سوال ہوتا تو میں کیا کرتا؟ میں بھی جوش میں آگیا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر چند ہی قدم بڑھا ہونگا کہ اس واقعہ کی اطلاع بیخبر کو دوں۔ لیکن اتفاق وقت دیکھئے کہ فلم کا سلسلہ ٹوٹ جانے کی وجہ سے ہال میں یکبارگی روشنی ہو گئی، اس وقت مجھے اپنی اور اپنے دوست کی بیوقوفی پر دل کھول کر ہنسی آئی۔ کیونکہ ان کے والدہ کے قریب کی مرد نہ تھا بلکہ چند مہذب لیڈیاں تھیں جن کے سر کے بال کٹے ہوئے تھے۔ او وہ فراک کے بجائے سوئٹر کوٹ پہنے ہوئے تھیں۔

(ساتھی)

گھونگھٹ کی آڑ

آخر کوئی کہاں تک انتظار کرے۔ ہندوستان کی فضا ایسی ہے کہ جب تک بی۔ اے کی ڈگری نہیں مل جاتی اس وقت تک شادی کا پاسپورٹ بھی نہیں ملتا۔ آخر ہم بی۔ اے پاس ہونے والے تھے اور بقول ہماری انا گلچمن کے بہت قابل بھی ہو گئے تھے۔ لیکن اب بھی ہمارے سہرے کے پھول نہ کھلے۔ ہم اپنے والدین کے حق میں دعائیں مانگا کرتے تھے۔ کہ بارالہا تو ان کے دل میں ایسی ڈال کہ وہ لوگ بیچین پر ہمارے گھر کے بسا نے کی فکر کریں مگر وہ لوگ کانوں میں تیل ڈالے بیٹھے تھے۔ شاید نوکری کا انتظار تھا۔ سب سے بڑی ستم ظریفی یہ تھی کہ دوستوں کو بھی اسی زمانے میں شادیاں کر کر کے ہم کو چڑھانا منظور تھا۔ ہم سب کی دعوتیں کھا آتے تھے۔ مگر افسوس کہ ابھی تک ہم کسی کو نہ دے سکے وہ لوگ اپنی اپنی بیویوں کے حمیز دکھا کر ان کی تعلیم و تربیت اور صورت کے قصے سُنا کر اور اپنی پر لطف زندگی کے حال کہہ کہہ کر ہم پر اور بھی ستم ڈھاتے تھے۔ ہمارے سامنے ہی ان کے چھوٹے چھوٹے سالے اور سانپاں اندر سے

آکر ان کو دولہ بھائی کہہ کر پکارتے تھے اور پان میں شکر ڈال کر اپنے محبت آمیز مذاق کو پورا کرتے تھے تو ہمارے دل میں برچھیاں سی لگتی تھیں۔ اور ہم یہ کہتے تھے کہ کاش ہم کچھ اور ہوتے مگر ہندوستانی مسلمان نہ ہوتے تاکہ اس ملک کی خود ساختہ جکڑ بند یوں سے بالکل آزاد ہو کر دولہ بھائی کہنے والوں کو ہبسا ہی کر لیتے۔

گھر میں تو یہ حال تھا مگر ہم باہر جس طرف جاتے تھے اس طرف یہی تذکرہ سنتے تھے۔ وہ لوگ ہم پر اس طرح زور دیتے تھے جس طرح کسی ایسی کنواری لڑکی کے لئے کہا جاتا ہے جس کی عمر دوشیزگی ختم ہو رہی ہو۔ ایک روز ہماری والدہ کی خالہ زاد بہن فرمانے لگیں۔ ”بیٹا کب تک پڑھنا رہے گا۔ ابھی جی نہیں بھرا۔ یہی عمر شادی بیاہ کی ہوتی ہے۔“

”اماں کو اختیار ہے۔“ ہم نے شرم کر کہہ دیا۔ گویا ہم ایک ہندوستانی خاتون تھے۔ ہم دل سے تو یہی چاہتے تھے کہ وہ اس مضمون کو اور زیادہ چھیڑیں۔ اور گھنٹوں اسی پر گفتگو کرتی رہیں اور ہم صرف ہاں ہاں کرتے سننے جائیں اور دل ہی دل میں اس تذکرہ لطیف سے لطف اٹھاتے رہیں۔ مگر انھوں نے ان دو جملوں کے بعد اس طرح چپ سادھی کہ جس طرح کوئی کچالاک میزبان ایک ناخواندہ ہماں کی کھانے پر صلاح سمجھتی کرے۔ اور پھر اس کے رسمی انکار پر خلاف امید چپ ہو کر کھانے میں مشغول ہو جائے۔ آخر جب ہم انتظار کی تکلیف سے تھک گئے تو ہم نے اس خیال سے کہ اگر ہمارا ذکر نہ سہی تو دوسری کامیابی ہو گیا۔

”آپ ہاشم بھائی کی شادی کیوں نہیں کرتیں؟“
 انا سنا تھا کہ وہ برس پڑیں۔ ”اے بیٹا کج کل کے لڑکے کسی کی سنتے ہیں،
 پڑھنے کے پیچھے ایسے دلوں نے رہتے ہیں کہ وہی کتابیں ہی بس ان کا سب کچھ
 ہو جاتی ہیں۔ خدا خدا کر کے پڑھ لئے تو اب نوکری کی فکر ہوتی ہے۔ یہی ان کا
 بھی حال ہے۔ کہتے ہیں کہ جبتک کم از کم تین سو روپیہ ماہوار نہ ہوں میں شادی
 ہی نہ کروں گا۔ انھیں اس کی فکر ہے اور مجھے دن رات یہی سوچنا ہے کہ ہے
 اللہ کا دیا خدا عمر دراز کرے ایک ہی بچہ ہے۔ اگر اس کی بھی نسل منقطع ہوگی
 تو ہمارے نام کا کوئی فاتحہ دلانے والا بھی نہ رہے گا۔“

ہم نے اس موقع کو غنیمت جان کر انھیں اور بھی اکسانا شروع کیا۔ جی
 ہاں! میں نے سائنس میں بھی پڑھا ہے۔ بڑے بڑے ڈاکٹر بھی یہی کہتے ہیں کہ
 بیس سال کی عمر کے بعد تو شادی ضرور ہی کر لینا چاہئے ورنہ.....“
 ”ہاں! انھوں نے گھبرا کر کہا۔ ”ایسا ہے“ میں ان کی پریشانی کو دیکھ کر
 دل میں خوب ہنسا۔ ”اے بیٹا! تیرا تو وہ دوست بھی ہے۔ بھائی بھی ہے ذرا
 راضی کر لے۔“ وہ گڑگڑا کر کہنے لگیں۔

”میں آپ کے کہنے سے پیشتر کسی مرتبہ اس بات کا تذکرہ کر چکا ہوں۔ میں
 نے اس بے ضرر جھوٹ کی آمیزش میں کوئی ہرج نہ سمجھا۔“ وہ کہتے ہیں کہ جب تم
 اپنی شادی کرو گے اسی وقت میں بھی کروں گا۔ میں نے ذرا شرماتے ہوئے کہا ”مگر

کسی سے کہئے گا نہیں۔" تاکید بھی کر دی۔

"ہاں! اچھا تو رہے گا! خالہ نے فرط مسرت اچھل کر کہا۔" میں تمھاری ماں سے کہو نگی اور ان پر زور ڈالوں گی۔ سچ تو ہے کیا لڑکے خود ڈھونڈ لائیں گے۔ ہے کیا اچھا رہیگا کہ دونوں کی شادی ایک ہی ساتھ ہو۔" جب میں وہاں اٹھا ہوں تو دل فرط مسرت سے رقص کر رہا تھا۔



دس پانچ عورتیں ایک جگہ بیٹھ کر شادی کے معاملے کو اس قدر جلد حل کر دیتی ہیں کہ لندن میں وہاٹ ڈال والے بھی ایسی سلطنت کے جس میں سو بچ بھی ڈوبتا ہی نہیں پیچیدہ مسائل اس قدر جلد نہیں حل کر سکتے جس طرح کوئی انٹرنر پاس ممکن نوکریوں کی ایک مکمل فہرست بنا کر عرضیوں کے پندوں کی تیاری کرتا ہے۔ اسی طرح قابل شادی لڑکیوں کی زبانی فہرست تیار کی گئی۔ اس بچ شادی بحث و مباحثہ ہوا اور بیحد سخت چینی کے بعد جس میں ممبران عمومی نے طعن و تشنیع کے مکے بھی استعمال کئے اور اپنے اپنے رزلیوشنوں کی تعریف میں مجرب بیان دھواں دھار تھا ریر سے زمین اور آسمان کے قلابے بھی ملائے گئے۔ یہاں تک کہ ووٹ اور کثرت آراء کے معاملے کو بالائے طاق رکھ کر جمہوریت کے بنیادی اصول کو پس پشت ڈال کر مسئلہ انتخاب کو میز مجلس (خالہ اماں) کے فہم و فراست کے حرم و کرم پر چھوڑ دیا گیا۔

انہوں نے چند کوچن لیا اور چند کو کچھ نہ کچھ عیب کال کر خارج از بحث کر دیا۔ اس غیر دستوری کونسل کے خود ساختہ صدر اور چیپہ کمیٹی کے رباں و مزارکان نے ایک بے ضابطہ اختیار حاصل کیا۔ جس کی رو سے انہیں اس بات کا حق حاصل ہو گیا کہ وہ طاقتور مہم جوئی کی حدود میں داخل ہو کر ان کی اخلاقی۔ اقتصادی۔ مالی اور تعلیمی حالت کی تفتیش کریں اور جلد از جلد اپنی رپورٹ جلسہ عمومی میں پیش کر کے اس بات کا موقع دیں کہ ان میں سے ایک پر سب متحد انجیال ہو جائیں۔ تاکہ فوراً اس منتخب قلمرو کے ڈکٹیٹر اور کارفرما سے اس اہم عہد نامہ کی تکمیل کے لئے گفت و شنید کریں جس کی رو سے ہم کو کچھ خاص مراعات کے ساتھ حقوق تجارت حاصل ہو جائیں۔ مگر ہم چونکہ حضور داسرائے بہادر کی طرح، وی۔ گو (خود اختیاری) کا پروا نہ بنی۔ اسے نئی ڈگری کے ساتھ ہی حاصل کر چکے تھے اس لئے ہمیں حق تھا کہ ہوم گورنمنٹ سے جس قدر بھی بل پاس ہوں۔ ان پر کدلی نہ کوئی انکسٹیجینی کر کے خارج کر دیں اور ہم وہی کریں جو ہمارے دل میں ہو ہم نے بھی اس قوت کا استعمال کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شورشیں ہوئیں مینظاہر ہوئے۔ مگر آخر کار شکست درپردہ سرپرستی ماننا ہی پڑی۔ ہم نے ان میں سے ایک بل کو اجازت دی کہ وہی ایجنڈا میں رکھا جائے۔ اور اس کے بعد اپنی تمام قوتوں کو مجتمع کر کے کوشش بھی کی کہ پاس بھی وہی ہو جائے۔

بیابان اور نوکری دونوں غلامی کے مختلف نام ہیں۔ اول الذکر بیوی اور
 سسرال کی اور آخر الذکر گورنمنٹ کی۔ دوسرے زاویہ سے دیکھا جائے تو
 دونوں شادیاں ہیں اور دونوں میں داماد بننا پڑتا ہے۔ خواہ خسر کا خواہ سرکار
 کا۔ دونوں کا حصول بھی مشکل ہے۔ اس لئے کہ نوکری کے لئے عرضی دینا پڑتا ہے
 پیش کرنا۔ سفارشات لانا۔ حکام بالا سے ملاقات کرنا۔ انتخابی کمیٹی کے سامنے
 پیش ہونا۔ طبی معاینہ کرانا۔ اور مقابلہ کے امتحان میں ٹھیکنا۔ بالکل وہی درجے
 ہیں جو ایک دو کو کمیا کر کے ہاتھوں اکسیر بننے تک پیش کرتے ہیں۔ فی زمانہ مقابلہ
 کے امتحان میں پاس ہونا بھی ایک آنچ کی کسر کے سلم البشوت اصول کو غلط ثابت
 کرنا ہے۔ ان تمام مرحلوں کے بعد جس طرح مدبرانگہ کے کشتے کو اصلی مزاج پر
 لانے کیلئے ایک عرصہ دراز تک زمین میں دفن کر دیا جاتا ہے۔ یا جو کے ڈھیر
 میں داب دیا جاتا ہے۔ اسی طرح کشتہ ملازمت کو بھی تقرر حاصل کرنے کے لئے
 امید داری کے قعر گنہ میں ایک لامحدود زمانہ تک ڈھکیل دیا جاتا ہے۔ عمر
 کے باقی حصے میں اگر بیوی کو طلاق دینا اور نوکری سے خلع لینا منظور نہیں ہے
 تو دونوں کے حصول کے لئے یہ تمام کڑیاں جھیلنا ہی پڑیگی۔ ورنہ دونوں طرف
 سے عمر بھر جھینکنا اور چھینکنا تو ہے ہی۔

ہم کو چونکہ گورنمنٹ اور اپنے خسر دونوں کا بیک وقت داماد بننا تھا،

اس لئے سرکار کے یہاں جتنی بھی قابل نکاح اسامیاں تھیں ان سب کے لئے ایک ساتھ نسبتیں بھیج دیں تاکہ کہیں ایک نہ ایک کے لئے تو انتخاب ضرور ہی ہو جائے۔ اسی اصول پر ہم بڑی سے بڑی نوکری آئی۔ سی۔ ایس، اس کے بعد پی۔ سی۔ ایس اس کے بعد پولیس سروس اس کے بعد تحصیلداری اس کے بعد قانون گوئی اور سیکریٹریٹ کے امیدوار بن کر کج کسی امتحان میں بیٹھے۔ کل کسی کی انتخابی کمیٹی میں پیش ہوئے اور پرسوں کسی کے طبی معاینے میں بلائے گئے یہاں تک کہ اوپر لکھے ہوئے ان تمام درجوں کو رفتہ رفتہ طے کر کے اب سرکاری ”ہاں“ یا ”نہیں“ کا انتظار کر رہے تھے۔

اسی دوران میں ہم دوسری دادی کے لئے وہ تمام درجے طے کر چکے۔ جو نسبت کی دینے اور مٹھانی کی رسم انتخاب تک ایک ہونے والے دوامہ کو پیش آتی ہیں۔ بردھوا جانے میں ہمیں وہی دقیقیں ہوئیں جو گورنمنٹ کی انتخابی کمیٹی کے سامنے پیش آئی تھیں۔

جب ہوم میرج کمیشن، بروزن پبلک سروس کمیشن کے لنوانی ارکان نے ہماری لاعلمی میں چلن کی نازک تیلیوں کے درمیان سے ہمارے کلاصوفاء علموں چہرے کو جس پر آئی۔ سلما کریم کی تقریباً ایک انچہ پالش کی گئی تھی اور پامبیا ویسلیں سے بالوں کو فینسی قواعد کرائی گئی تھی۔ ہر ممکن زاویہ نگاہ سے ایک سائنسداں ترزو بازی کی طرح جانچ پڑتال لی۔ اور ہماری ہونے والی

سُسرال کے غبس دکورنے سی۔ آئی ٹی کی طرح ہمارے شجرہ نسب چال چلن اور خاندانی کیفیات سے کما حقہ آگاہی حاصل کر لی۔ اور ہم نے ان متم مقابلہ کرنے والے دولہاؤں پر جن میں ہمارے یک جان دو قالب گریجوٹ دوست بھی تھے۔ اپنی فوقیت ثابت کر دی۔۔۔۔۔ اس وقت ہم نے اطمینانی سانس لی۔

خدا کا فضل جب شامل حال ہوتا ہے تو جگڑے ہوئے کام بن جاتے ہیں۔ ہم آئی سی ایس۔ پی سی ایس۔ پولیس سروس وغیرہ میں ناکام ہے۔ اس لئے کہ ہم اپنے نازک دماغ کو جبکہ ہمارا گاندھی کی ہنگامہ آرائیاں ہو رہی تھیں۔ ایک دوسرے دار آفیسر بن کر پبلک کے اوپر بندوق کی نشانہ بازی کی تکلیف نہیں دینا چاہتے تھے مگر سیکریٹریٹ کے امتحان مقابلہ میں کامیاب ہو گئے جس ہم ہندوستانیوں کی آبائی خدمت ”جی ہاں“ کو اچھی طرح انجام دے سکتے تھے پیر دولوں بیٹھے۔ آہن کرار ایک شدید انتظار کے بعد اس طرف سے بھی سٹھنی کی مانگ آئی اور اب ہم حنڈا کا شکر کہ نوکری بہادر اور بیوی بہادر کے ذیل خطاب کے مستحق ہو چکے تھے۔

۴

”من در خیالیم و گورنمنٹ در خیال“۔ جس زمانہ میں ہماری بات چیت چل رہی تھی۔ اسی زمانہ میں سارو اصحاب نے اسمبلی میں اپنا بل پاس

کروا کے ہندوستان کی سب زمین پر قریب البیاض لڑکے اور لڑکیوں پر بڑا
 ستم کیا۔ ہم چاہتے تھے کہ اس قانون کے نفاذ سے پہلے ہی ہماری منگنی، نکاح،
 اور خصتی کی تمام رسمیں معرضِ غلو میں آجائیں۔ مگر چونکہ ہم لوگوں کے یہاں کٹنے
 والی شادی کے لئے اتنا ہی سامان مصالحوہ اور اسباب فراہم کرنا ہوتا ہے،
 جتنا کہ گذشتہ جنگ عظیم کیلئے قیصر ولیم کو ایک ربع صدی کی مدت میں
 کرنا پڑا تھا۔ اس لئے ہماری خواہش کا پورا کرنا گویا پتھلی پر سرسول جمانا تھا۔ ہم
 نے اپنے ان بے تکلف دوست کو حق کی بینوں کے لئے صحیفہ سنوانی میں
 ”کان پیارے تو بالیاں اور بیوی پیاری تو سالیان“ کی آیت موجود ہے۔ یہ
 سنائی سنائی بڑی سر مغزنی کرنے کے بعد یہ بات ان کی سمجھ میں آئی تو وہ بھی
 گھبرا گئے کیونکہ تقریب نکاح کی تاریخ سارا بل پاس ہونے کے صرف دو
 ہی ماہ بعد تھی اور اس پر طرہ یہ کہ ہماری جوانی والی بیگم صاحبہ اس نئے قانون کے
 لحاظ سے پورے ایک سال ایک ماہ اور تین ماہ بعد ہی بیاہی جاسکتی تھیں۔
 واقعی بڑا ظلم تھا۔ گورنمنٹ کو کم از کم ان لڑکیوں کا خیال ضرور رکھنا چاہئے تھا۔ جو
 زیادتی خون کی وجہ سے اپنی اہلی عمر سے کئی برس بڑی معلوم ہوتی ہیں۔ اگر خدایا جان
 کا قول صحیح تھا تو وہ اس قدر جلد بڑھ رہی تھیں کہ جس طرح چڑھتا ہوا چاند بڑھتا ہے
 اور اسی لئے اُن کے والدین کو بھی اس قانونی مجبوری سے نہیں
 ہوا۔ کیونکہ ان کی خواہش تھی کہ وہ گھٹتے ہوئے چاند کی شکل میں آسمان

— عروسی پر جلوہ افغن نہ ہوں۔ بلکہ چہرہ بدرے کر ہی نمودار ہوں۔

انگریزی حساب سے ان کی عمر تو کم تھی ہی۔ ہم نے عورتوں کے حساب میں ان جی ایک اور مدار دو کے حساب سے دیکھا تب بھی سوائے سوا مہینہ کے فائد کے اور کچھ ہاتھ ہی نہ آیا۔ اس لئے سعدی علیہ الرحمہ کے قول کے مطابق۔ ”اگر خواہی سلامت برکنار است“ کے زیریں اہل پر چل کر قہر درویش رجان درویش خاموش ہو کر بیٹھ رہے۔ دل تو یہ چاہتا تھا کہ تمک کے قانون کی طرح ہم بھی اس قانون کو توڑ ڈالیں اور جیل یا جرمانہ کے بعد بیک وقت عروسی اور لیڈری دونوں کے ہار پینیں مگر ”عشق تو کرتے مگر گھر کام ہے“ میں تسلیم کر کے ”جیل تو جلتے مگر گھر کام ہے“۔ دل ہی دل میں کہتے رہے اور خاموش ہو کر بیٹھ رہے۔ اس کے علاوہ اور کر ہی کیا سکتے تھے۔



”اور کیسی ٹپری مرے لٹدی“۔ ہمارے ہی زمانے میں گاندھی جی کو ہندوستان آزاد کرانے کی فکر ہوئی۔ ہمارے ہی وقت میں مینا بھری تجارت میں کساد بازار آیا ہوئی اور ہمارے ہی لئے ہندوستانی گورنمنٹ کی قانونی جیب خالی ہو گئی اور ہمارے ہی موقع پر سار دابل پاس ہوا گویا ہندوستان کی آب و ہوا اس زمانہ میں کچھ اور ہو گئی تھی۔ اور رامائن کے زمانے میں بھی خرد سال لڑکے اور لڑکیوں کی شادی سے بہت بٹا نقصان ہوتا تھا۔ ادھر سار داجی کے ہاتھوں شادی کی

لمبی چوڑی تقریب سکڑ کر منگنی رہ گئی۔ اور اُدھر گاندھی جی کی ستیہ گرہ کے سبب سکرٹریٹ کی ملازمت امیدواری میں تبدیل ہو گئی۔ وہاں ایک سال تین ماہ تین دن کی کسر تھی اور یہاں جگہ خالی ہونے کے انتظار کی کھینچ تھی جس کی مدت بھی تقریباً اتنی ہی تھی۔ یا اس سے بھی زیادہ۔ خیر اگر دونوں طرف سے القظ نہیں ہوتی تھی مگر ایک زمانہ کیلئے بھی ضرور مل گئی تھی۔ ہم نے کہا چلو اچھا ہی ہوا جب سے ہوش سنبھلا اسکول، کالج اور یونیورسٹیوں میں ہندوستانی اساتذہ کی نالز واداکے تحفہ مشق بنے رہے جو ہم سے سیدھے منہ بات کرنا۔ اخلاق سے پیش آنا اور ہماری خودداری کو برقرار رکھنا تو کجا، ہم کو دیکھتے ہی ایسی صورت بنالیتے تھے جیسے پردہ سینا پر کوئی ہندوستانی ایگٹر جنوں اور فریاد کا منہ چڑھا رہا ہو۔ ڈگری ملنے کے بعد افسران سرکاری کے پاس کام نہ گدائی لئے ہوئے پھرے۔ اب کچھ دنوں کے لئے تو اطمینان ہو جائیگا۔ سچ مانے جس طرح گھوڑا اپنی پیٹھ پر کاٹھی کا بوجھ اُمنے میں لگام کی زنجیر اور پیر میں چکر والی رسی نہ پا کر منہ بچا کر کے بے تحاشہ دوڑنا شروع کرتا ہے اور جو سامنے آتا ہے اس کے دو لٹیاں رسید کرتا ہے اسی طرح ہم بھی ہر طرف سے آزاد ہو کر اپنے بھانجی، بھانجیوں اور بھتیجی بھتیجیوں کے سامنے خوب دلچے۔ کودے، اچھلے اور ان بچوں کو منہسی مذاق میں ہی طمانچہ چپٹاؤ اور کان مروڑی سے رُلا رُلا دیا۔

دوسرا دور

اسباب ضرورت، ناشتہ، امام ضامنوں کی پوٹ اور بزرگوں کی نصیحت اور تاکید کے طومار ساتھ لے کر ہم چھٹی منزلے نکلے اور ہندوستان کے پھاٹک کی طرف پرانی اصطلاح میں چل کھڑے ہوئے اور اس زمانے کے محاط سے ٹکٹ لے کر سوار ہو گئے۔ اب یہ تو ایسا مستقل عنوان ہو جائے اگر ہم یہ بیان کرنے لگیں کہ ہم نے وہاں کیا دیکھا۔ لیکن مختصراً اتنا کہ دنیا کافی ہو گا کہ ہمارا ساکلج کی چوڑی دیواری میں رہنے والا ایک دوشیزہ مثال نوجوان جب اس وسعت میں داخل ہوا تو کیا کیا آنکھوں پر سے پردے ہٹنے کی وجہ سے خیرگی پیدا ہو گئی۔ اور شیشہ دل سے محکومیت کا کاکا اچھلنے کی وجہ سے جذبات شوق و اضطراب پھلکنے ہی لگے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۶

ہاتھ سے جاتا رہا دل اور کیا دل سے شکیب
مگر "عشق تو کرتے مگر گھر کام ہے" کو مد نظر رکھ کر جولانی طبع کو زیرِ لگام کرنا ہی پڑا۔ اور صرف "آنکھیں میری باقی ان کا۔ میرا حصہ دور کا حلوہ پر عمل کرتے ہوئے دائرہ تفریح کو چشمہ شوق ہی تک محدود کر دیا۔

تفریح و سیر کے ساتھ ساتھ تجربہ اور رویہ بیک وقت ہاتھ آئے تو کیوں نہ لیا جائے۔ اشیاء درآمد و درآمد کے ایک بڑے آفس میں ہم کو نوکری مل گئی

اور ہم نے ایک سال نہیں گزارنے کا پکا ارادہ کر لیا۔ اور اسی مضمون کا ایک خط بھی مکان پر لکھ دیا۔ حالانکہ ہمارے میکے والے (یہ لفظ مردوں کے لئے بھی استعمال ہو سکتا ہے) اور سسرال والے بمبئی جیسے شہر میں جہاں ان کے خیال میں صرف دق اور حضرت آدم کو جنت بدر کرنے والی ہستیوں کے سوا کچھ تھا ہی نہیں ہمارے رہنے کے قطعی خلاف تھے۔ مگر آخر کار ان لوگوں کو بھی ہمارے کانگریسی دلائل پر سر تسلیم خم کرنا ہی پڑا۔

یوں تو تمام وقت گوناگوں مصروفیتوں اور تفریحوں میں گزر جاتا تھا۔ لیکن اس خاص عمر میں اس خاص شہر میں اور خاص ماحول میں ایک صبح سے دوسری صبح ہونے تک ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ جس میں سوسائٹی، مطالعہ، موسیقی، سیر و تفریح اور نیند جیسی روح نواز مشغلوں سے بھی تسکین نہیں ہوتی۔ گویا یہ ایک قسم کا دورہ ہوتا ہے۔ میں نے تجربہ کیا ہے کہ اس وقت دل کی پیچیدگی، بڑھتی ہی جاتی ہے۔ دماغ بہت سبک ہو جاتا ہے اور خیالات تیز رفتاری کی انتہائی منزل تک پہنچ جاتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اس دورہ کو کس نام سے تعبیر کیا جائے۔ میں نے اس کی دو قسمیں کی ہیں۔ دورہ ازدواجی اور دورہ شاعری، مگر مجھ کو تشخیص سے معلوم ہوا کہ مجھ پر نہ تو اول الذکر تھا اور نہ آخر الذکر، بلکہ میرا مرض دورہ مضمون نگاری تھا جس کی علامات دورہ شاعری سے بہت مشابہ ہیں۔

میں ہومیو پتھی کا قائل ہوں، جس میں علاج بالمثل کا اصول استعمال کیا جاتا ہے اسی لئے میں نے دور و مضمون نگاری کا علاج، مضمون نگاری ہی سے کرنا شروع کیا۔ ڈاکٹر ان علم ادب کی رائے ہے کہ ہندوستان جہاں اور بیماریوں اور بلاؤں کا گھر ہے وہاں شاعری اور مضمون نگاری کے جراثیم کے لئے بھی اس کی فضا بہت موزوں ہے۔ اور یہ مرض فی زمانہ بہت ترقی کر گیا ہے۔ مگر میں ان کی رائے سے اتفاق نہیں کرتا۔ دراصل یہ مرض آلو اور دوسری مہلک بیماریوں کی طرح یورپ سے لایا گیا ہے۔ چھلپے خانوں کی ایجاد سے اس کے جراثیم میں بے حد زیادتی ہو گئی ہے۔ پرانے ہندوستان میں اس مرض کا کوئی خاص نام بھی نہ تھا۔ اس لئے کہ یہ اختلاج قلب کی طرح شاہانہ مرض تھا۔ خاص آدمیوں ہی کو ہوا کرتا تھا۔ اور اس کی دوائیں بھی قانون اور دوسرے محزنوں میں نہیں لکھی جاتی تھیں۔ بلکہ راز سرستہ کی طرح پوشیدہ رکھی جاتی تھیں جن کا علم اکثر و بیشتر جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔

یہاں تو خیر اس کے مریضوں پر خفیف ہی حملہ ہوتا ہے اور بہت سے اچھے بھی ہو جاتے ہیں لیکن یورپ میں یہ مرض وبا کی شکل میں اب تک موجود ہے کسی زمانے میں اس کے اندفاع اور حفظ ماتقدم کی تدابیر وہاں کے ماہر ان فن بھی سوچتے رہے لیکن ۶ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ آخر کار مجبور ہو کر حلفت کو فطرت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا۔

اور ہے بھی یہی بہترین ترکیب۔ اگر آپ ٹھنڈے دل سے غور کریں تو آپ کو اس مرض سے نقصات کی بجائے فائدے ہی زیادہ معلوم ہوں گے۔ کیونکہ یہ مرض بے انتہا متعدی ہے اور اس کے کیڑے آنکھ اور کان کے ذریعہ جا کر تندرستوں کو بھی مبتلا کر دیتے ہیں۔ ادھر آپ نے زبانی سنایا اخباروں میں پڑھا کہ فلاں بھلے چنگے آدمیوں پر بُری طرح اس مرض کا دورہ ہوا ہے اور وہ اپنی عبرتناک حالت سے دوسروں کو بھی متاثر بنائے ہوئے ہیں۔ بس سمجھ لیجئے کہ آپ بھی بیمار ہو جائیگے۔ یا بیمار ہونے کی کوشش کریں گے۔ اگر کچ نہ سہی تو کل۔ ہاں تو جب مریضوں کی اس قدر زیادتی ہوتی ہے تو ڈاکٹروں، ہسپتالوں، دوا خانوں اور دوا سازی کے کارخانوں کو کس قدر فائدہ ہونا چاہئے؟

دو تین سال ہوئے کہ لکھنؤ میں طبریا پھیلا۔ وہی پھر سیلک کے خون میں۔ تو طبریا کے کیڑے چھوڑتے تھے اور ڈاکٹروں کی جیبوں میں چاندی کے سکے اور گائے کے نوٹ ڈالا کرتے تھے۔ ادھر خزانے کھلتے تھے۔ گھر برباد ہوتے تھے۔ فالتے مرتے تھے اور ادھر فلتے مارنے والے نئی نئی عمارتیں اور مطب خانے تیار کر رہے تھے۔ اسی طرح دورہ مضمون نگاری کے بیمار بھی اپنا عزیز وقت مہنگا کاغذ اور ڈاکخانہ کے ٹیکوں میں گاڑھی کمانی کاروپہ دے کر ادب کے عطاؤں سے سننے اور دوائیں منگوا منگوا کر تجارت اور بازار کی رونق بڑھانے میں کتنی کوشش کر رہے ہیں۔

میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ خیر میں نے مضامین لکھے۔ صحیح اور صاف کر کے کئی کئی نقلیں اتاریں بڑے بڑے لفافوں میں رکھیں اور ایڈیٹروں کو جواب کی حمت سے بچانے کے لئے جوابی ٹکٹ رکھ کر ہندوستان کے مقتدر پرچوں کے نام روانہ کریں

جس طرح کوئی مالی زمین میں بیج ڈالتا ہے اور صحیح سویرے جا کر زمین کو کرید کرید کر دیکھتا ہے۔ اسی طرح میں بھی ڈاکخانہ کے روزانہ چکر لگایا کرتا تھا۔ اوڈاکیہ کو اگر وہ راستہ میں مل جاتا تھا ساٹھ لکھ روپے سے اتروا کر یہی سوال کیا کرتا تھا، ”کو میرا کوئی پرچہ ہے؟“ جب وہ انکار کیا کرتا تھا تو میں تاکید ”کہا کرتا تھا۔“ ذرا دوبارہ دیکھ لو کہیں کسی خط میں نہ چپک گیا ہو۔“ زمانہ انتظار ہی انتظار میں گذرتا گیا۔ اگر ہمارے مضامین کی کوئی وقعت ہوتی تو جواب بھی آتا اور پرچہ بھی آتا آخر کار ہم نے یقین کر لیا کہ ہم میں مضمون نگاری کی قابلیت ہی نہیں ہے۔ اس لئے اس لئے کی طرح جس نے انٹرنس کا امتحان دیا۔ فیل ہوا اور چھوڑ دیا۔ اسی طرح مرد مضمون نگاروں کی فہرست سے ہم نے اپنا نام خود خارج کرالیا۔

اب یہ سوال تھا کہ ہندوستان کے نروانی رسالوں میں کیا سب مضامین عورتوں ہی سے زور قلم کا نتیجہ ہیں۔ میرا خیال ہے کہ نہیں۔ ان میں بعض عورتیں خود لکھتی ہیں بعض اصلاح اور مدد دیتی ہیں اور بعض اسی طرح کی مضمون نگار ہوتی ہیں۔ جس کے حکم بہت سے ہر مائینس مقرر، اول الذکر کی شہرت ان کے

بھائیوں اور شوہروں کی منت کش ہے اور آخر الذکر کی کسی گڈری کے لعل کے روز فکر کی۔ ایسے گھونگھٹ کی آڑ لینے والے مرد یا تو اس دباؤ میں لکھتے ہوئے کوئی گلے میں ہاتھ ڈال کر اٹھلاتے ہوئے کہتا ہوگا۔ "اللہ دیکھو! بتو آپا کا نام" ناخبروں میں آنے لگا ہے۔ ہیں بھی کچھ لکھ دو۔" یا وہ خود اپنے دوستوں کے سامنے فخر جتانے کیلئے ایسا کرتے ہونگے۔ اور جب کہیں کسی ہم صحبت کے ہاں جاتے ہونگے تو وہ پرچہ بھی ساتھ لیجاتے ہونگے۔

"دیکھئے فانی صاحب کی غزل کتنی زوردار ہے بھی خوب لکھ ہے۔"

"لایئے لایئے دیکھیں۔" ان کے دوست دانت نکال کر کہتے ہیں۔

"ٹھہریئے میں پڑھ کر سناتا ہوں۔" ورق اس طرح رک رک کر اٹھتے ہیں کہ میرے یار کی نظر پڑ ہی جائے بیگم منم اور سر منم پر، جہاں نگاہ ٹھہری بس سمجھ لیجئے مقصد حاصل ہو گیا۔ "ارے تمھاری وائف بھی لکھتی ہیں۔ واللہ کج ہی معلوم ہوا لانا، لانا، اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔" لیجئے وہ اس مضمون میں منہمک ہو گئے فانی اور جوش معرض التوا میں رہے۔

ہم نے بیگم منم کے نام سے مضامین اس لئے لکھے کہ اول تو شایع ہونے میں وقت نہ ہوگی۔ دوسرے عورتوں کے نقطہ نگاہ سے مضامین بہت مقبول ہونگے اور تیسرے یہ کہ ہماری ہونے والی بیگم صاحبہ ہم سے شادی ہونے تک کافی مشہور ہو جائیگی اور اس آسمان سے گری ہوئی شہریت بہت خوش ہونگی۔

مضمون لکھنا، دستہ اعلیٰ کی غلطیاں کرنا۔ تحریر ذرا بگاڑنا۔ ایڈیٹر اس کو ملفوف خط ادنیٰ کی جھونک میں لکھنا ذرا دقت طلب امور تھے۔ خیر سر انجام ہو گئے مگر ایک مرحلہ باقی رہ گیا۔ ہندوستان میں عورتیں تو چونکہ پردہ دار ہیں ہی۔ ان کا نام بھی پردہ دار ہے۔ اس لئے ہمیں اپنی بیگم کا نام ابھی تک نہیں معلوم تھا لہذا ایک طبعزاد نام جس کے ہر ہر حرف سے خوبصورتی ٹپکتی تھی بیگم منم کے الفاظ پر اس طرح آویزاں کر دیا جس طرح سائن بورڈ پر رات کے وقت بجلی کا بلب۔

نئے مضمون نگار پر سالہ کار عبث ٹھانے کے لئے ایڈیٹروں کا عموماً قاعدہ ہے کہ وہ اس کے مضمون کو ایک خاص مدت تک امیدواری کے خانے میں ضرور رکھتے ہیں۔ خواہ اس کا مضمون کتنا ہی نفیس کیوں نہ ہو، اور ان کو اس کی کتنی ہی سخت ضرورت کیوں نہ ہو۔ یہی حشر ہمارے بیگمی مضمون کا بھی ہوا۔ انتظار بہت برا ہوتا، ہم تقاضہ کا خط لکھنے بیٹھے۔ مگر آخر میں آکر بیگم منم کا خود ساختہ نام جو بھولے ہیں تو ایسا بھولے کہ باوجود یاد کرنے کے یاد نہ کیا۔ اور یاد آیا تو بالکل غلط، اور اس کا پتہ ہم کو اس وقت چلا جبکہ ایڈیٹر اس کا خط ہمارے نام آیا جس میں استفسار کیا گیا تھا کہ اس مضمون کو آپ کی کن بیگم سے منسوب کیا جائے؟ آیا پہلی سے

یاد دوسری سے؟

ہر حال مضامین شائع ہونے لگے اور ہماری مفروضہ بیگم اردو ادب میں نام پیدا کرنے لگیں، ان کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے

لہ میرے پاس میرے بہت سے دوستوں کے خطوط آئے جن میں سے ایک کو ذیل میں نقل کرتا ہوں۔

”..... بیگم ابوظاہر کے معنائیں بہت مقبول ہوئے ہیں۔ پہلے تو میں یہ خیال کرتا تھا کہ شاید تم خود لکھا کرتے ہو۔ لیکن طرزِ تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ کسی تعلیم یافتہ خاتون ہی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں۔ اس لئے میں تم کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اس کے بعد شکایتاً لکھتا ہوں، بُرا نہ ماننا اگر تم مجھ کو شریک نہ کرتے تو کم از کم اطلاع ہی دیدیتے۔ یوں خاموشی سے شادی کر لینا مرا ہم دوستی کے سخت خلاف ہے، اگر تم اس کو راز ہی رکھنا چاہتے تھے تو کیا میں تمہاری نظر میں قابلِ اعتبار نہ تھا۔

میرے ان خیالات کو تمہارے دوست قمر صاحب کے بیان سے اور بھی تقویت پہنچتی ہے۔ جن کو تمہاری شادی کا مکمل علم ہے۔ مگر میں یہ نہ سمجھا کہ گھر پر تمہاری شادی طے ہو چکی تھی اور کبھی بھی ہو چکی تھی۔ اس کو تم نے بلا جواب دیئے ہوئے کبوں ایسا قدم اٹھایا بہر حال ۶ امورِ ملکیت خویشِ خسر و ادا داند۔ خیر میری طرف سے آپ کی مس نہر جہاں (بیگم.....) کی خدمت میں جو کم از کم ایف اے معلوم ہوتی ہیں سلام نیاز تو ضرور کہہ دیجئے گا۔ (تمہارا ہاشم حسین)

سچ بتائیے اگر آپ میری پوزیشن میں ہوتے اور ایسا خط موصول ہوتا تو آپ اس زبردست مغالطہ پر کس قدر ہنستے۔ میں نے مضامین کس غرض کے ماتحت لکھے اور یہ لوگ کیا سمجھے؟ ستم ظریفی کی حد ہو گئی۔ میں اس قدر ہنسا کہ پیٹ میں بل پٹکے پسیدیاں دکھنے لگیں اور آنکھوں سے پانی جاری ہو گیا۔

ہنسی ختم ہونے پر میں نے خط پھراٹھایا اور کئی بار پڑھا۔ ہر مرتبہ نیا لطف ملتا تھا۔ ”قرصاحب کے بیان سے تقویت ہوتی ہے۔“ اب اس جملہ پر میری نظر ٹھہری۔ ہنسی کا بادل ہٹ جانے کے بعد عقل کی روشنی نمودار ہوتی ہے شروع میں میں نے اس پر غور نہیں کیا تھا۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ قرصاحب وہی ہیں جو میری تنگنیر سے شادی کرنا چاہتے تھے اور شروع میں میرا اور ان کا زبردست مقابلہ رہا تھا۔ مجھ کو یقین ہو گیا کہ وہ میری اس بے گناہ تفریح کو اصلیت کا جامہ پہنانے کی کوشش کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھینگے۔ ابھی میں غور ہی کر رہا تھا اور کسی خاص نتیجہ پر بھی نہیں پہنچا تھا کہ دو سکر ہی روز میری والدہ کا خط بھی آیا۔ جس میں میرے اس مفروضہ فعل قبیح پر نفرت و حقارت کا اظہار کیا گیا تھا جو کبھی میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ آپ حضرات کی تفریح کے لئے اس کو مجسّمہ نقل کئے دیتا ہوں۔

”..... آخر تم نے وہی کیا کہ جس کا مجھ کو ڈر تھا۔ وہاں پر تمھارے نوکری کرنے اور رہنے ہی سے میں سمجھ گئی تھی کہ اب تم میرے ہاتھ سونگئے

مجھ کو تو اب بھی نہ معلوم ہوتا اور میں اسی طرح بیوقوف بنی بیٹھی رہتی
اگر..... (لڑکی کے والد) خود آکر تمہاری بیگم صاحبہ تمہاں کی تصویق
اور مضمون نہ دیتے۔ تم نے یہ حرکت کر کے ہم لوگوں کو کہیں کا نہ رکھا،
میں تو منہ بھی نہیں دکھا سکتی۔ شریف تو زبان پر جان دیدیتے ہیں
مگر تم ایسے ہوئے کہ منگنی کا بھی خیال نہ کیا۔ بھلا منگنی اور شادی میں
کیا فرق ہے۔ دو بول ہو کر وہ تمہاری ہو جاتی۔ اولاد کی تمنا لوگ
اسی دن کے لئے کرتے ہیں کہ ماں باپ کے ہاتھوں پر ایسی ایسی چیزیں
کر کے کلنگ کا ٹیکہ لگائیں۔

خیر اس لڑکی کا بھی خدا تھا۔ اس کا بھی عنقریب نکاح
ہونے والا ہے۔ میں نے ان لوگوں سے چند دن اور ٹھہرنے کو کہا تھا
تاکہ تمہارے خط سے تفصیلی واقعات معلوم ہو جاتے۔ مگر جب انھوں
نے کہا کہ رسالہ میں تصویر کے ہوتے اب کیا شک رہ گیا۔ تو میں بھی
خاموش ہو گئی۔ یہ میرا آخری خط ہے۔ تم جہاں رہو خوش رہو مجھ
سے کوئی مطلب نہیں۔

خط کو ختم کر کے میں سر کپڑ کر بیٹھ گیا۔ دماغ چکرا رہا تھا۔ دل کے دھڑکنے کی آواز
کانوں تک آرہی تھی۔ ہاتھ پیر کانپ رہے تھے اور سارا جسم پسینے پسینے ہو گیا
تھا۔ نہ معلوم اس حالت میں کتنی دیر بیٹھا رہا۔ اس کے بعد مجھ پر رونے کا دھڑ ہوا

آنسوؤں کے نکل جانے سے جب ذرا دل ہلکا ہوا تو میں نے خیال کرنا شروع کیا کہ مضمون تو میں نے ہی بھیجے تھے۔ یہ تصویر کا کیا معاملہ ہے۔ کیا میری بد قسمتی نے ایسا رنگ لیا۔ یا بیگمی عبارت نے لوٹ پوٹ کر اس تصویر کا مجسمہ اختیار کیا یا ایڈیٹر نے اپنے سخیل کو کام میں لا کر مضمون کی زینت بڑھانے کو ایسی حرکت کی ہے۔ یا قمر صاحب نے چالاکی کی۔ میں نے وہ سارے پھر نکالے۔ واقعی قسمت مجھ کو پریشان کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ ایک رسالہ میں میری بیگم کے مضمون کے بالکل مقابل ایک ہندوستانی لیڈی کی تصویر آرٹ پیپر پر تھی اور اس کے نیچے صرٹ "ایم جہاں" کے الفاظ تحریر تھے۔ اس کے متعلق ایڈیٹر کے ریمارکس رسالہ کے شروع میں شذرات کے کالموں میں دیے گئے تھے۔ آپ پنجاب کی کوئی الوالہ عنبر خاتون تھیں۔ جنہوں نے اول نمبر میں بی۔ اے پاس کیا تھا۔ صورت حال اب میرے سامنے تھی۔ قمر صاحب نے مضامین کو دیکھا۔ اس کے بعد اس رسالہ میں اس تصویر کو بھی دیکھا۔ خوش قسمتی سے ایم۔ جہاں پر ہر جہاں کا بھی اطلاق ہو سکتا ہے جو میری بیگم کا سفر و مضامین تھا۔ صاحبہ تصویر کا تعارف بھی صفحہ تصویر پر نہ تھا۔ یہ تمام باتیں اتفاقات اور میری بد قسمتی سے یکجا ہو گئیں اور قمر صاحب کو اس پر جھوٹ کی عبارت کھڑی کر لینا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ مگر تعجب تو یہ تھا کہ میرے گھر والوں نے اور ان کے گھر والوں نے رسالہ کے شذرات کو ذرا غور سے دیکھا تو ہوتا تاکہ انہیں معلوم ہو جاتا کہ یہ کس کی تصویر ہے اور ایم جہاں

اور مہر جہاں ایک ہی ہیں یا دو۔ میں نے وہ رسالہ بیگ میں رکھ لیا اور باقی سب کو جلا دیا۔ نوکری کو استغنیٰ دیدیا۔ اور پہلی ہی گاڑی سے گھر روانہ ہو گیا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ راستہ کس کرب و بے چینی سے گزرا ہے۔ جس وقت ہم نے مجنوط احوال کے عالم میں آواز دی ہے تو سب گھر گئے جب حقیقت معلوم ہوئی ہے تو ہمارے بھائی صاحب اس اتفاق اور ستم ظریفی پر باوجود مجھ سے محبت رکھنے کے اس قدر مجبور ہو گئے کہ میرے غم کا خیال بھی نہ رہا اور بیباختہ ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔ ادھر وہ نہیں رہے تھے۔ ادھر ہم منہ بسورے ہوئے بیٹھے تھے۔

آخر ان کو رحم آیا۔ وہ فوراً ہم کو ساتھ لے کر ان کے گھر گئے۔ ان کے والد کو اس واقعہ کی اصلیت کا علم ہوا ہے تو وہ کھڑے کے کھڑے رہ گئے مگر اور کمرہ ہی کیا سکتے تھے۔ فخر صاحب کے ساتھ آٹھ گھنٹہ قبل سارا ایکٹ کے سوتے ہوئے بھی نکاح ہو چکا تھا۔ ہمارا واقعہ ایسا تھا کہ جو سنا تھا وہ ہلکے ساتھ ہمدردی کرنے کے بجائے۔ الٹا ہنستے ہنستے بتیاب ہو جاتا تھا۔

اس وقت ان تمام حالات کے اظہار سے یہی مقصد ہے کہ میری طرح جن لوگوں کی عنقریب شادیاں ہونے والی ہیں، اور وہ گھر سے دُور بھی ہیں ان کو اگر دورہ مضمون نگاری ہو تو وہ گھونگھٹ کی آڑ لے کر میدان صحافت میں نہ اتریں۔ ورنہ میری طرح بچھٹا نا پڑے گا۔

اب میں ثبات عقل و درستی ہوشتی و حواس کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ
 کہ میرے بیگمبھی مضامین جس جس نے بھی پڑھے ہیں وہ اس بات کا یقین کر لیں کہ
 وہ ایک مفروضہ ہستی تھی۔ اور میں ابھی تک کنوارا ہی ہوں۔ تاکہ اسندہ
 کوئی دوسرے قمر صاحب پیدا ہو کر میرے خلاف اس دشمنی کو دہرانہ دیں
 جو پہلے کی جاچکی ہے۔ اگر اس اعلان کے بعد بھی کوئی صاحب مجھ کو شادی
 شدہ سمجھیں تو میں ان کی اس غلطی کا ذمہ دار نہیں ہوں۔

(سالنامہ نیزنگ خیال)

روشن دماغ

سگریٹ کی ترکیب آگ، تمباکو اور لذت کے عناصر سے ہوئی ہے۔ جن میں سے آگ دوزخ سے، تمباکو اور جہیل سے اور لذت حضرت آدم کی لغزش اول سے حاصل کی گئی ہے۔ چنانچہ اس آتشیں گناہ کی چٹکاری نے ہمارے قلب کو سوز و غم بنا دیا ہے اور ہماری ناک کو اس سوز کی گدڑ گاہ قرار دیا ہے۔ سروالٹر ریلے کا خادم بڑا عقلمند اور دور اندیش آدمی معلوم ہوتا تھا کہ اس نے اپنے مالک کے تنھوں سے دھواں نکلتے دیکھ کر ان کے سر پر پانی کی پوری بالٹی انڈیل دی تھی تاکہ یہ لگی ہوئی آگ پھیلنے نہ پائے۔ اگر یہ محض آگ ہی ہوتی تو وہیں بجھ جاتی۔ لیکن وہ کیا کرے کہ یہ تو دھواں تھا۔ جو ہمیشہ نکلتا رہتا ہے۔ اور آگ سلگتی رہتی ہے۔

حضرت دل غ نے عوروں کی فرسودگی کی بنا پر جنت میں داخل ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن ہم میں سے تمام شاعر اور مضمون نگار باستثناء اس حقیر کے شاید سگریٹ ہی کی بنا پر جنت سے اٹھے پاؤں واپس آجائیں نہ شکیں۔ وہاں ایڈیٹروں کا طبقہ موجود ہوا اور وہ غلمان نمبر حوض کوثر نمبر اور شاخ طوبی

نمبر کی تیاریوں کے لئے ہم پر حسبِ عادت شدید تقاضے جاری رکھیں، اس وقت ہم سگریٹ کی غیر موجودگی میں کس طرح ان کی فرمائش پوری کر سکتے ہیں؟ سگریٹ کا دھواں مضمون آفرین ہے۔ اور اسی بنا پر ہم نے اسے روشن دماغ کہا ہے۔ اس کے حلقے حسن، قص اور نزاکت کے اجتماع سے جذبات کے زندہ گروے بن جاتے ہیں۔ جو سگریٹ پینے والے کے گرد و فضا میں نظام شمسی کے سیاروں کے طرح چکر لگاتے رہتے ہیں اور وہ ایک شانِ کبرائی کے ساتھ بیٹھا ہوا اپنے لبوں کی خفیف جنبشوں سے ہواؤں کا طوفان اٹھانے پر لے کر وں کو از سر نو تخلیق کرتا رہتا ہے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک کہ یہ دودھ پارے ”طلسم خیال“ کی بندشوں میں قید ہو کر کاغذ کی سطح پر ”شہ پاروں“ کی شکل میں مستقل صورت نہ اختیار کر لیں۔ اسی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ اس طرح لکھے ہوئے مضامین کے وزن، وسعت اور اثر کا تعین سوختہ سگریٹوں کے ٹکڑوں کو شمار کر کے کیا جاسکتا ہے۔ صاحبِ مضمون کو چاہئے کہ وہ اپنے مضمون کی پیشانی پر اس شمارہ کو بخطِ حلی لکھ دیا کرے تاکہ اس کی ”سگریٹ پاؤر“ کو پڑھ کر ناظرین اس کے مضمون کی قدر و قیمت کا اندازہ اسی طرح لگا لیا کریں کہ جس طرح برقی مقمہ پر اس کی ”کینڈل پاؤر“ کو پڑھ لیتے ہیں۔ مضامین کے معیار اور اس کی سگریٹ پاؤر کو بڑھانے کیلئے اڈیٹروں کا فرض ہے کہ مضمون کی فرمائش کرنے سے قبل مضمون نگاروں کو اعلیٰ سگریٹوں

کے ڈبے پارسل کر دیا کریں۔

اسی سلسلے میں میں اپنے ایک دوست کا تذکرہ کرنا مناسب خیال کرتا ہوں کہ جو مضامین تو لکھتے تھے لیکن ان کے اختتام پر اقباسِ نقل - سرقہ - ملخص او ترجمہ لکھنا بھول جاتے تھے۔ میں نے اس طرف ان کو متوجہ کیا تو عذر کرنے لگے کہ طبعاً د مضامین دماغ میں پیدا ہی نہیں ہوتے۔ میں نے عرض کیا کہ اولاد اور مضمون طبعاً پیدا کرنے کیلئے چند مجرب نسخے استعمال فرمائیے۔ اول الذکر کے لئے مفرح اور آخر الذکر کیلئے سگریٹ تیر ہدف ثابت ہونگے۔ کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے۔ کہ پہلی تجویز قبل از وقت ہے اور خارج از بحث اور دوسری تجویز مفرح کیونکہ سگریٹ کے ایک کش کی قیمت ہماری زندگی کا ایک قیمتی لمحہ ہے میں نے کہا اسی طرح طبعاً د مضمون کی ایک سطر بھی ہماری زندگی کا ایک لمحہ کم کر دیتی ہے۔ اس پر کہنے لگے کہ سگریٹ پی کر مضمون کی ایک سطر لکھنا گویا اپنی عمر کے دو قیمتی لمحوں کو فروخت کرنا ہے اور وہ بھی مفت۔ میں مسکرا کر خاموش ہو رہا کیونکہ اس کی تردید ناممکن تھی۔

بہر حال سگریٹ مضمون نگار کے لئے سید ضروری شے ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ دوسروں کے لئے غیر ضروری ہے۔ اس سے کون شخص انکار کر سکتا ہے کہ شادی شدہ کے لئے بیوی اور مجرد کے لئے سگریٹ بہترین مونس تنہائی ہیں۔ بشرطیکہ چند ضروری لوازمات بھی موجود ہوں۔

خصوصیت سے سگریٹ سے محفوظ ہونے کے لئے سرد ہوا، مرغن غذا اور آرام
کری کسی طرح نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔

اس کے علاوہ سگریٹ جیلہ تعارف اور وسیلہ دوستی بھی ہے، پارک ٹرین
اور سینما میں عارضی بچائی کے موقعوں پر گفتگو کا آغاز سگریٹ ہی سے اٹھایا جاتا
ہے۔ باوجود اس کے کہ سگریٹ پیش کرنا احسان نہیں ہے بلکہ اخلاق ہے
لیکن چونکہ انسان فطرتاً ممنون واقع ہوا ہے۔ اس لئے دل میں جگہ پیدا ہوئی
جاتی ہے۔ اسی اہمل پر بابوؤں اور کانستبلوں کو سگریٹ پلانا کبھی بیکار نہیں
جاتا۔ یہ ایک قسم کا سرمایہ ہے کہ جو فوری نفع میں منتقل ہو جاتا ہے۔ ایسیاں
ہے کہ نیکی کرنے کے بعد قیامت تک انتظار کھینچنا پڑے۔ چنانچہ میرے ایک
ہوشیار دوست سگریٹ ہی کے بل پر اکثر ہٹ دھرمی سے قانون اور اخلاق
دونوں کو بالائے طاق رکھ کر غیر واجبی مراعات حاصل کر لیتے ہیں۔ اور میں کہ جو
ایک اطاعت گزار بندہ کی طرح قانون شکنی کو سرکار کی شان میں شرک
خیال کرتا ہوں اکثر اسے موقعوں پر نقصان مایہ و شہامت ہمسایہ کے چکڑ
میں آجاتا ہوں۔ ————— کیونکہ میں سگریٹ پینا جانتا ہوں، پلانے کے
آرٹ سے واقف نہیں۔

سگریٹ جلد ایک حلقہ احباب پیدا کر لیتا ہے لیکن اگر احتیاط نہ برتی جائے
تو یہ حلقہ جلد ٹوٹ بھی جاتا ہے۔ سماجی زندگی دراصل لین اور دین کے سیدھے سادے

اصول پر مبنی ہے۔ اس یوہا میں ترازو کے دونوں پلڑے جب تک برابر نہیں ہوتے اس وقت تک کام نہیں چلتا۔ ٹھیک اسی اصول پر دوستوں میں سگریٹ کی لین دین بھی چلتی ہے۔ ہم سگریٹ دوستوں میں بددلی اور نفاق کا یہی سبب ہے کہ تم نے اپنے دوست کے جتنے سگریٹ پھونکے تھے اتنے واپس نہیں کئے یہ ضروری نہیں ہے کہ سگریٹ اسی جنس میں واپس کئے جائیں۔ بلکہ جس طرح عید کے روز کسی دوست کی سوئیوں کے سبب دلہ میں زردہ بھی بھیجا جاسکتا ہے۔ اسی طرح سگریٹ کا ترصض پان یا چاکر کی شکل میں ادا کیا جاسکتا ہے۔

”سگریٹ کش“ دو قسم ہوتے ہیں۔ میرا مطلب آدمیوں سے ہے نہ کہ بایپ سے، ایک ہنگامی اور دوسرے دائمی چنانچہ میں نو آموز سگریٹ کشوں کو مشورہ دوں گا کہ وہ ہنگامی پیینے والوں پر اپنی سگریٹ برباد نہ کریں کیونکہ نہ تو ان کو پیینے میں لطف آئے گا اور نہ پلانے کا خیال پیدا ہوگا۔ البتہ دائمی قسم کے لوگ بڑے دلچسپ ہوتے ہیں اور حلقہ ”دود کشی“ میں شامل کرنے کے لائق۔ چنانچہ میں اسی سلسلہ کا عادی مجسم ہوں کیونکہ سگریٹ میری کمزوری ہے۔

میں اگر کسی سگریٹ سازی کے کارخانہ میں پہنچ جاؤں تو وہاں ایک ایسا سگریٹ تیار کروں جس کی لمبائی چوبیس گھنٹہ ہو۔ کیونکہ میں فکر میں

سگریٹ پھونکتا ہوں خوشی میں پتیا ہوں اور غصہ میں چباتا ہوں۔ مجھ کو دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ قدرت نے مجھے انجن کا صمبیر غایت فرمایا ہے۔ اور سگریٹ کو ایک مزید عضو کی شکل میں میرے ہونٹھوں پر چسپاں کر دیا ہے۔ تاکہ دودکش کا کام دیکھے۔ اس لئے میں تسلسل کو قائم رکھنے کے لئے ان لمحات کو کہ جو ایک سگریٹ کے ختم ہونے اور دوسرے کے جلنے تک وقوع پذیر ہوتے ہیں کن کی مدد سے معدوم کر دیتا ہوں۔

میں ہر مہینہ کے ابتدائی دور میں اپنے دوستوں کے ساتھ سگریٹ کشی کی محفلیں منعقد کرتا ہوں۔ میری خواجگاہ کی کھڑکی میں سے مخصوص طریقہ سے اتوار کو اس طرح مسلسل دھواں نکلا کرتا ہے کہ جیسے شاہی همان تھا کے باورچی خانہ میں سے۔ مہینہ کے آخری دور میں میں اپنے مکان کی نشست ترک کر دیتا ہوں۔ کیونکہ اس زمانے میں مجھے اپنے دوستوں سے قرض وصول کرنے کی ضرورت لاحق ہو جاتی ہے۔ جس روز کسی نادہند دوست سے سابقہ پڑتا ہے۔ اس روز میں سگریٹ کے جلے ہوئے ٹکڑوں ہی پر قناعت کر لیتا ہوں جب وہ بھی باقی نہیں رہتے تو میں دعا کرتا ہوں کہ کسی طرح لوٹ پوٹ کر مجسم سگریٹ بن جاؤں۔ تاکہ میں سگریٹ کو پیوں اور سگریٹ مجھ کو پیئے اور فی الواقع یہ دعا قبول بھی ہو جاتی ہے کیونکہ میں محسوس کرتا ہوں کہ میں جل رہا ہوں مگر سر یا پیروں کی طرف سے نہیں بلکہ قلب کے درمیانی حصے سے۔

میں چاہتا ہوں کہ سگریٹ مجھ کو چھوڑ دے۔ کیونکہ میں اس کے چھوڑنے پر قادر نہیں۔ میں اس کو ہزار بار آزمایا چکا ہوں۔ میں احرام باندھ کر نیت کرتا ہوں کہ کج سے سگریٹ کو ہاتھ تک نہ لگاؤں گا۔ لیکن میں اپنے سگریٹ ان کی نظر کرتا ہوں تو اس میں رکھے ہوئے سگریٹوں کے برباد جانے پر متفکر ہو جاتا ہوں اس لئے باقی ماندہ سگریٹوں کو یکبارگی سلگالیتا ہوں۔ تاکہ یہ قصہ جلد ختم ہو جائے ان کو ایندھن کی لکڑیوں کی طرح جلا ڈالنے کے بعد میں سگریٹ دان، دود، کش (پائپ) اور آگ پیٹی (دیا سلائی) کو بابر کے ظروف و نوشی کی طرح، یا تو دریا برد کرنے کا ارادہ کرتا ہوں، یا اپنے کسی جانی دشمن کو پیش کرنے کا لیکن اسی دوران میں مجھے کچھ خلش سی محسوس ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ کھو گیا ہے۔ اسی اثنا میں یاد آتا ہے کہ مجھے ایک موقر رسالہ کے لئے کچھ لکھنا ہے۔ اور وہ شروع بھی نہیں کیا جاسکتا جب تک کہ روشن دماغ سے شغل نہ کیا جائے۔ لیجئے میں اپنے نوکر کو آواز دیتا ہوں۔ لیکن وہ منہس کر ڈالتا ہے۔ کیونکہ میں اس سے قبل اس کو تنبیہ کر چکا ہوں کہ وہ سگریٹ کے معاملہ میں میرا کہنا نہ سُنے۔ آخر میں مجبوراً خود اٹھتا ہوں اور قریب کے رستوران سے ڈبیہ خرید کر واپس ہوتا ہوں۔ اور پھر اسی زہریلی فضا میں محصور ہو جاتا ہوں۔ رات کو مجھے اپنی بے بسی پر غصہ آتا ہے تو میں فطرتاً سے بمقار ہو کر تازہ سلگایا ہوا سگریٹ زمین پھینک دیتا

سو جاتا ہوں۔ اور تین مرتبہ بکار بکار کر کہتا ہوں۔ ”اب سگریٹ کبھی نہ پونگا۔“
 صبح کو آنکھ کھلتی ہے تو ہاتھ تنکے کے نیچے سگریٹ دان کی تلاش میں مشغول
 ہو جاتا ہے۔ لیکن جب دیکھتا ہوں کہ وہ بالکل ہی خالی ہے تو بیقرار ہو جاتا ہوں
 معا مجھے رات کے پھینکے ہوئے سگریٹ کا خیال آتا ہے۔ میں دیوانہ وار اس
 کی طرف دوڑتا ہوں۔ اور جب دیکھتا ہوں کہ واقعی وہ میرے پاس پائڈان کے
 قریب پڑا ہوا میری طرف مسکرا مسکرا کر دیکھ رہا ہے تو میرے چہرے پر
 بھی تبسم کھیلنے لگتا ہے۔

(نیزنگٹ لیل)

مول تول!

خانم - (خود بخود) سُنتی ہوں کہ کلکتہ اور بمبئی میں کئی کالج ہیں جہاں لڑکوں اور لڑکیوں کو مال فروخت کرنا سکھایا جاتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ایسا کوئی کالج نہیں جس میں مال خریدنا سکھایا جاتا ہو۔ کاش کوئی اللہ کا بندہ اس طرف توجہ کرے تو میں سب سے پہلے اپنے پروفیسر صاحب کو داخل کر دوں کیا کروں میں زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہوں۔ ورنہ اس فن پر ایک اچھی خاصی کتاب لکھ کر تبا دیتی۔ خاص طور سے وہ انگریزی پڑھے ہوئے جنٹلمینوں کیلئے بہت مفید ثابت ہوتی جو بازار جاتے ہیں تو میرے پروفیسر کی طرح دونوں آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ اور ہاتھوں کی مٹھیاں کھول دیتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کی بدولت دوکانداروں کے یہاں گھی کے چرلرغ جلتے ہیں۔ اور ہماری مظلوم بہنوں کے یہاں پانی کے۔

(عرشی باہر سے آتا ہے)

عرشی - بھابی جان! سیتا پوچھتا ہے کہ دہی منگوایا جائیگا یا نہیں؟
خانم - (چونکتے ہوئے) ہاں، کیوں نہیں! پروفیسر صاحب دہی بغیر

ایک دن بھی نہ جئیں گے۔ وہ تو کہتے ہیں کہ خدا خواستہ اگر میں مرجاؤں تو دلہی کے پانی سے غسل دیا جائے اور اسکی بالائی پر فاتحہ۔

عرشی۔ خیر اس کا انتظام تو بعد کو کیا جائیگا۔ اس وقت کتنی ضرورت ہے؟
خاتم۔ کتنا بتاؤں؟ سارے گھر کو اس کا چسکہ لگ گیا ہے۔ واقعی
ہے بھی مفید چیز۔ ہاضم طعام۔ مقوی دماغ۔ کامریر یلح۔ مسکن قلب۔ دافع ختلج
وجہ ت جگر (عرشی مسکراتا ہے) اے ہنستے کیوں ہو۔ روز سنتے سنتے یہ الفاظ
حفظ ہو گئے ہیں۔

(لودہی۔ باہر سے ایک گھوسن کی آواز آتی ہے)

ہاں خوب یاد آیا۔ میں موئے چوٹے مسینا سے کبھی نہ منگواؤں گی۔ لاتے لاتے
اوپر کی بالائی خود چپٹ کر جاتا ہے۔ اور پھوکس ہم کو دیتا ہے۔ کج بیگھوسن
سے خود خرید ونگی۔ (عرشی اٹھنے کا ارادہ کرتا ہے) بیٹھے رہو۔ دہی والی اپنے
خریداروں کو خود ڈھونڈھ لیگی۔ مگر جناب ذرا خاموش بیٹھے گا۔ میں سودا
خریدتے وقت کسی کا ٹپ ٹپ بولنا پسند نہیں کرتی۔ دیکھو اور تجربہ حاصل
کر و کہ میں کس عقلمندی اور ہوشیاری سے سودا چکاؤں گی۔ اس بول بول کا
معاملہ میں بندی سب کو مات دے سکتی ہے (خود اپنی پیٹھ ٹھونک کر) میرا اصول
ہے کہ دام کم سے کم دیتی ہوں اور مال زیادہ سے زیادہ لیتی ہوں۔

عرشی۔ (مسکراتے ہوئے) خطا معاف بھابی جان، کہیں بھائی جان کو آپ

اپنا ہم خیال نہ بنا لیجے گا۔ ورنہ وہ ایک کامدانی کی قیمتی ساڑھی کے بجائے ایک جرن کھڈر کی ساڑھیوں ہی پر اکتفا کرینگے۔

خاتم۔ مان گئی بھائی، تم کبھی کبھی ایک آدھ بتا عقلندی کی بھی کہہ جاتے ہو۔

گھوسن۔ (دروازے میں داخل ہوتے ہوئے) دہی چاہئے سرکار؟

عرشی۔ ہاں ہاں بڑی سخت ضرورت ہے۔ تمہارا ہی انتظار تھا دیئے جاؤ۔

خاتم۔ (باواز) کس کو ضرورت ہے بھئی! مجھ کو تو نہیں چاہئے (عرشی سے)

تم خاموش کیوں نہیں بیٹھتے۔ ضرورت ظاہر کر کے اس کا دماغ ساتویں آسمان تک

پہنچا دیا۔ اب وہ ضرور اکڑ جائیگی۔ تم اتنا نہیں جانتے کہ لاڈلی اور لے دہی میں

بڑا فرق ہوتا ہے۔ سودا خریدنے کا پہلا گڑ ہمیشہ یاد رکھو کہ دوکاندار سرٹیک کر

مر جائے مگر یہ کبھی نہ بتاؤ کہ تم کو کس چیز کی ضرورت ہے (گھوسن صحن میں کھڑی ہو جاتی

ہے)۔ (گھوسن سے) اے عورت خالی دہی پیچتی ہے کیا؟

گھوسن۔ آج کل اسی کی نکاسی ہے بیگم صاحب۔

خاتم۔ چھی۔ دہی بھی کوئی کھانے کی چیز ہے۔ جو خریداجائے۔ لوگ بھی کتنے

بیوقوف ہیں کہ پھٹے ہوئے دودھ کو کس شوق سے لے کر کھاتے ہیں (عرشی کو سننی

آتی ہے) میں خیال کرتی ہوں کہ جتنے امراض اس سے پیدا ہوتے ہیں۔ اتنے

کسی اور چیز سے نہیں ہوتے۔ بد ہضمی۔ قراقر۔ ریلج۔ بادی بوایسر۔ دردِ سر

کی بیماریاں اسی کے دم قدم سے ہیں۔ جاؤ بیوی کہیں دوسرا گھر دیکھو یہاں برکت ہو۔

گھوسن۔ حنف ذرا چکھ کر تو دیکھئے۔ پھر جوجی چاہے کہئے گا۔ بری والے
نواب صاحب اس پر سے پلاؤ بریانی قربان کرتے ہیں۔

خاتم۔ نوح میں دہی چکھوں۔ ایک مرتبہ جب میں چار برس کی تھی تو میری
انانے ایک ہی انگلی چٹا دیا تھا۔ جب سے ابکائیوں کا مرض ہو گیا تھا جی
اپنا اپنا مزاج ہے۔

گھوسن۔ آپ کی خوشی بگم حساب۔ جاتی ہوں۔ بندگی۔
(دروازے کی طرف ٹرتی ہے)

خاتم۔ اے یہ دہی والی تو بڑی تیز دار معلوم ہوتی ہے۔ کیسی لچھے دار
باتیں کرتی ہے۔ صورت بھی انسانوں کی سی ہے۔ بھولی بھالی۔ اے ذرا بات تو
سُن (گھوسن پلٹ آتی ہے) تیرا کیا نام ہے؟ کہاں رہتی ہے؟ آگے تو تو پسینے
میں تھے۔ برف کا پانی پئے گی؟

گھوسن۔ اللہ آپ کا جی سکھی رکھے۔ کلیجہ ٹھنڈا رہے۔ میں بھی کنویں
کا ٹھنڈا جل پی کر آئی ہوں۔

گھوسن۔ تیری قسمت ہی میں نہیں ہے بیٹھ! بیٹھ! ٹکڑی (دہی) الی بیٹھ جاتی ہے
تیرے بچے وچے ہیں یا نہیں، روٹی کھا نیگی تو؟

گھوسن۔ جی نہیں سرکار، آپ کا دیا میرے گھر پر سب کچھ موجود، صبح کھا کر چلی۔
خاتم۔ ہاہ! مجھے بری حالت پر رحم آتا ہے۔ پھول سی صورت دھوپ

میں مجلس کر رہ گئی ہے۔ روکھی سوکھی روٹی کھا کر چلی ہوگی؟ کیا کہوں گھوسن! نہ معلوم میرا دل تیری طرف کیوں کھینچا جاتا ہے۔ تیسری آنکھ میں موہنی ہے کیا؟ پان تبا کو کھائیگی کیا؟

عرشی - (علحدہ) مجھ کو تو اس کی آنکھ میں موتیا بن نظر آ رہا ہے۔
گھوسن - جی نہیں، ایک مرتبہ جب میں چار برس کی تھی تو کھایا تھا
جب سے مجھے _____

خاتم - ابکائیوں کا مرض ہو گیا۔ ہاں تب تو میری اور تیری طبیعت ایک سی ہے۔ میری طرح تو بھی نازک لہر معلوم ہوتی ہے۔ میں تجھ سے ایک بات پوچھوں، تو مجھ سے بہن آپا کر گئی؟ (عرشی سے) ذرا چھری تولو لاؤ۔ میں اس کو خربوز کھلاؤنگی۔ (گھوسن سے) کیوں کھائیگی؟ (عرشی سے) یہ دوسرا گرتباتی ہوں، دوکاندار سے سودا خریدنے سے پہلے دوستی کر لیا کرو۔ سمجھے؟
گھوسن - بیگم میں ہندو جاتی ہوں۔

خاتم - اے ہے تو جب سے چھپا رہی تھی پہلے سے کیوں نہ کہا۔ میں اتنی دیر میں ہمسائے کے برہمن سے تیری رسوائی کا انتظام کرا دیتی۔ میں تجھ سے بہن آپا کر کے بہت خوش ہوئی، سچ کہتی ہوں مجھے ہندو بہت پسند ہیں صفائی ایمان داری، محبت و وفاداری سب کچھ موجود ہے۔ (عرشی سے) دیکھو اس کی صورت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نفع لیتی ہی نہ ہوگی کبھی مسلمان تو دو گئے دہ لیتے ہیں

عرشی۔ جب کوئی خریدنا ہی نہیں تو کیا کریں۔
 گھوسن۔ آج کل تو میں لاگت سے بھی دو آنے کم پر بیچتی ہوں۔
 عرشی۔ کیا کہنا۔ دہی فنڈ کی متولی ہے نا۔
 خاتم۔ ہاں! اگر ایسا ہے تو پھر میں بھی آج سے دہی کھانا شروع کر دوں گی
 اور روزانہ کچھ ہی سے لیا کروں گی۔

عرشی۔ کہیں ایسا غضب کیجئے گا۔ ابکائیوں کا مرض پھر پدا ہو جائیگا۔
 خاتم۔ اونہ۔ جان جائے یا رہے۔ اپنی بہن آپن کی خاطر یہ بھی سہی میرا
 مطلب صرف اتنا ہے کہ اس کی آمدنی ہو کسی طرح۔ غریبوں کی آمدنی بڑھانا ہمارا
 فرض ہے بتو! (باوازا) سینا سے باہر جا کر کہو کہ خبردار ہمارے دروازے پر کوئی
 دوسری گھوسن قدم نہ رکھنے پائے ورنہ ٹانگیں توڑ دادوگی۔
 گھوسن۔ نہیں حضور ایسا ظلم نہ کرایئے گا۔ پریشور آپ کو سلامت رکھے
 سب اپنی اپنی قیمت اور دھن کا کھاتے ہیں۔

خاتم۔ (عرشی سے) تیسرا گرتا ہی ہوں، دکاندار کو نفع کرانے کی تھکی دنیا
 دینا چاہئے تاکہ وہ لالچ سے اندھا بن جائے اور میری جگہ سوا میر تول جائے۔
 عرشی۔ (علحدہ) گویا کمیشن آجینٹ ہو جانا چاہئے۔

خاتم۔ (گھوسن سے) تیرا مال میں اپنی سہیلیوں کے ہیاں بکوا دیا کروں گی
 اور اپنے میکے میں بھی تیری سفارش کر دوں گی۔ وہ لوگ اتنے رئیس ہیں کہ

مُنہ مانگے دام دینگے۔ مُردار! تو چند دن میں سونے کے زیور نہ بنوالے تو میرا ذمہ
مگر شرط یہی ہے کہ تو مجھ کو —

گھوسن۔ (بات کٹ کر) سرکار! آپ کی جوتیوں کے طفیل، میرے مال
کا اتنا مان ہے کہ ایک دو ڈیوڑھیوں کو پورا نہیں پڑتا۔ کہاں تک بناؤں
رام کرے کھانے والے سامانت رہیں۔ سونے کا زیور تو اب بھی گھر پڑا ہے
آپ کے سامنے کس مُنہ سے ہنوں۔

عرشی۔ سرکار کیوں کہتی ہے۔ بہن کیوں نہیں کہتی اب۔
گھوسن۔ (منہس کر) بھیا کی باتیں۔

خاتم۔ ہاں وہ تمہاری طرح زبانی جمع خرچ نہیں کرتی۔ مُنہ سے نہ کہا تو
کیا ہوا، دل میں تو سمجھتی ہے۔ بہن! میں ایک شرط سے ہی لونگی۔ تم کو اس
کے پیسے لینا پڑینگے۔ اقرار کر لو پہلے۔ وہ اور بات ہے کہ نفع نہ لو مجھ سے۔ مگر
لاگت تو میں زبردستی دوں گی۔ گھوڑا اپنی گھاس سے دوستی کر گیا
تو کھائے گا کیا؟

گھوسن۔ اے حضور! آپ کیوں فکر کرتی ہیں اسکی۔ کے پیسے کا دہی ہوگا
میں تو بڑی امیدیں لے کر اس دروازے پر آئی ہوں۔ اللہ آپ کی عمر
ہزاروں برس کی کرے۔ آپ دیتے دیتے تھک جائیے گا۔ مگر میں لیتے
لیتے نہ تھکوں گی۔

عرشی۔ (علیحدہ) شاباش دی والی۔ تو بھی سودا بیچنے کے گروں کے واقف معلوم ہوئے؟
 خاتم۔ (چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں) اچھا دیکھیں تمہارا دہی۔ (گھوسن
 خوجہ پر سے کپڑا ہٹاتی ہے۔ خاتم جھک کر دہی کے کونڈے کو دیکھتی ہے) (علیحدہ)
 دہی تو بڑا نفیس معلوم ہوتا ہے (عرشی سے) چوتھا گرتا ہی ہوں۔ دوکاندار کے پاس
 خدا کے ہاتھ کی بنی ہوئی چیزیں بھی ہوں تب بھی ان میں دوچار عیب ضرور
 نکال دینا۔ (گھوسن سے ناک چڑھا کر) ابھی جیسی تمہاری باتیں ہیں ویسا تو دہی
 نہیں ہے۔ اسے ہے کیسا سفید ہے۔ کچھ میٹھی میٹھی بو بھی آ رہی ہے۔ شاید تمہارے
 جانور مہوے کے پھول کھاتے ہیں۔ جمبی۔ ان پھولوں کی شراب بنتی ہے،
 معلوم نہیں اس دہی کا کھانا شرع سے جائز ہے یا نہیں۔ خیر اس وقت تو شک کا
 مسئلہ ہے۔ مولوی صاحب پھر دریافت کر اؤنگی مگر بالائی کی تہہ اتنی موٹی کیوں ہے
 چکنائی بھی بہت ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اس کے ریشے میری آنٹوں میں جا کر پھنس جائیں
 ثقیل ہوتے ہیں۔ خیر ڈاکٹر سے پھر کبھی پوچھو گی۔ اپنی بہن آپن کی خاطر دین اور دنیا
 دونوں کی تکلیف اٹھانا پڑے تب بھی کوئی ہرج نہیں۔ (عرشی سے)
 کیوں جی چکھنا چاہئے!

گھوسن۔ اسے چکھنا کیسا! کھا کر دیکھئے۔

خاتم۔ بن۔ رفن۔ بانو۔ تم سب آ کر دہی چکھو (بچے دوڑتے ہوئے آتے ہیں)
 مگر دیکھو سچ سچ تباہ کیا ہے؟

(خاتم - بنن - رفن - بانو اپنے اپنے ہاتھ پھیلاتے ہیں - دہی والی چکچکتی ہے - مگر آنکھیں مل کر ٹھوڑا ٹھوڑا رکھ دیتی ہے -)

عرشی - میں ایک ہاتھ پھیلاؤں یا دونوں؟
خاتم - تم زبان نکالو (علحدہ) کیا خوش فائقہ دہی ہے۔ سب جان لیں
(گھوسن سے) دہی کھانے کے قابل تو نہیں ہے جیسی صورت ہے ویسا مزہ بھی ہے
بچوں کو آنکھ کا اشارہ کرتی ہے) پھیکا!

بنن - (اماں کو دیکھ کر) نہیں اماں یہ تو کڑوا ہے۔

رفن - ارے واہ یہ تو بکھا ہے۔

بانو - کہیں ہو بھی نہیں - یہ تو کھٹا ہے۔

گھوسن - (علحدہ) یہ دوانی ہنڈیا ٹھوڑی ہے کہ سب مزے موجود ہیں
(خاتم پانی سے کلی کرتی ہے)

بنن - اماں میرا جی متلاتا ہے۔

رفن - مجھے ابکائی آتی ہے۔

بانو - میرے پیٹ میں درد ہوتا ہے۔

گھوسن - (علحدہ) اے بھگوان!

خاتم - (عرشی سے) پانچواں گریڈ رکھو - دوکاندار کے سامنے اس بابا کا

تذکرہ ضرور کرو کہ تم کسی پولیس انیسر کے دوست یا عزیز ہو۔ اس سے دل پر

رعب بیٹھا ہے۔ (گھوسن سے) ہے کیا کروں۔ یہ کیسا دہی ہے تمہارا۔ ؟
 جاؤ بچو۔ میں تمہارے قربان لالچی کھاؤ ہوا میں ٹھلو۔ تھوڑی دیر میں طبیعت
 ٹھیک ہو جائیگی۔ مگر خاموش رہنا کسی سے کہنا نہیں۔ نہ معلوم پولیس
 کو خبر ہو جائے تو پجاری کا خونچہ پھین کر حوالات میں بھیج دیگی (بچے باہر کی طرف
 جاتے ہیں) ہے کہاں چلے؟ خدا کے لئے کہیں چچا جان خانہ دار سید
 دلاور علی سپرنٹنڈنٹ پولیس کے پاس نہ چلے جانا۔ ہاں اور کیا۔ وہ تو ہر ایک کے
 پیچھے ہتھکڑیاں لئے پھرتے ہیں۔ میں کسی غریب کو ستانا نہیں چاہتی اور پھر یہ تو
 میری بہن کہن ہے۔ کیوں ہے نہ ٹھیک؟

گھوسن۔ اے واہ بیوی، اچھی دھکی دیتی ہیں آپ۔ میں کسی دہیاست
 کی رہنے والی نہیں ہوں جو ڈر جاؤنگی۔ (اٹھتی ہے) میں راجے ہمارے کی ڈیوڑھی
 پر جانے والی ہوں اس مال کی قدر وہی لوگ خوب کرتے ہیں۔ نہ بیٹا ایک
 نہ دنیا دو (خونچہ اٹھاتی ہے)

عرشی۔ بھابی جان پانچویں گرمیں میں کرنا پڑیگی۔ آپ کو اس کا پانسہ لٹنا پڑیگا۔
 خاتم۔ اچھا دام بول دام، کیا بھاؤ دیگی۔
 گھوسن۔ بیوی کیا کرو گی لیکے۔ میرا دہی پھیکا ہے۔ کڑوا ہے کھٹا ہے بجٹا
 ہے۔ اس میں کچھ ملا ہوا بھی ہے۔ (خونچہ سر پر رکھتی ہے)
 خاتم۔ اے ایک دام بولو، ایک دام۔

گھوسن۔ مجھے بیچا ہی نہیں ہے بیوی۔ ایسا ہی دوز بیچیں توفاقے مرنے لگیں
 خانم۔ (غصہ میں) بس خاموشن چھو نہ رانگہری۔ بنو (باواز) سیتا
 سے باہر جا کر کہو کہ خبردار ہمارے دروازے پر یہ گھوسن قدم نہ رکھنے پائے
 ورنہ ٹانگیں توڑوا دوں گی۔

عرشی۔ (مسکرا کر) بہن آپن ہے بھابی جان!

خانم۔ اسی بات کا تو خیال ہے — ورنہ!

عرشی۔ مگر چھپا کر تو بتایا ہی نہیں۔ مجھے افسوس تو اس بات کا ہے کہ
 صرف دہی چکائی ہوئی۔ ابھی مول تول کے اہم مسئلے تو یوں ہی رہ گئے (گھڑی بھیکر)
 اس نائیک کا پر وگرام ابھی آدھا ہی دکھا با گیا۔ اس پر بھی ایک گھنٹہ تیرہ منٹ
 صرف ہوئے اگر پورا پر وگرام ہوتا تو تین گھنٹے لگتے۔

خانم۔ کیا بجائے عرشی؟

عرشی۔ ایک بجکر پچیس منٹ!

خانم۔ (پریشان ہو کر) ہے ہے آج پروفیسر صاحب بھوکے ہی رہ گئے
 بارہ بجے کھا لیتے تھے وہ۔ مگر میری کیا خطا ہے۔ کھانا تو صبح ہی تیار ہو گیا
 تھا۔ یہ دہی کے جھکڑے میں روئیر ہو جاتی ہے۔ آج میں ان سے صاف کہہ دیتی
 کہ بابا مجھ سے دہی کا انتظام نہیں ہو سکتا۔ (عرشی سے) جاؤ سیتا سے کہو
 کہ لپک کر دہی تو لے آئے۔

مسیقتا۔ (باہر سے) دہی اس وقت نہیں ملیگا۔ آج کل بارہ بجے کے بعد
کہیں نام کو بھی باقی نہیں رہتا۔

(پروفیسر باہر سے داخل ہوتے ہیں)
پروفیسر۔ آج مجھ کو بھوکا ہی مار ڈالا۔ انتظار کرتے کرتے آنکھیں پتھر گئیں۔ اگر
آپ کے میرے کھانے کا انتظام نہیں ہو سکتا تو صاف کہہ دیجئے۔ ہنر مند موجود ہیں۔
خاتم۔ شوق سے جناب! روکا کس نے ہے! پہلے وجہ تو پوچھی ہوتی آپ نے
یہ آپ کے دہی کی وجہ سے دیر ہوئی ہے۔ کب سے ڈھونڈھوا رہی ہوں۔
مٹا ہی نہیں۔

پروفیسر۔ یا قیمت طے نہیں ہوتی ؟

(ڈراپ)

(عصمت)

دُکھی دایہی

اسپتال کی بنیاد ڈاکٹر، نشتر، جلاب، کلور فارم، اور نرس کے غنام خمسہ پر قائم ہے۔ جن میں سے ہر ایک عنصر انسان کے حواس خمسہ کو معطل کر دینے کا ذمہ دار ہے۔ اس مکان میں مریض کی زندگی اس کی حسیات کی موت سے شروع ہوتی ہے۔ اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہاں موت کس حالت کا نام ہے۔ اور زندگی کس کیفیت کا۔ اگر کوئی حقیقت کہی جاسکتی ہے تو وہ زندگی، اور موت کا کسچر ہے۔ جس کی ابتدا کلور فارم ہے اور انتہا نرس۔ درمیانی لمحوں میں نشتر، ڈاکٹر اور جلاب کی کار فرمائی رہتی ہے۔ جس سے سرد ہم کو بحث نہیں۔ البتہ کلور فارم اور نرس مریض کے مدت قیام میں ہمیشہ ایک دوسرے کے مدد و معاون رہتے ہیں۔ جس وقت ایک کے اثرات ناکل ہونا شروع ہوتے ہیں تو دوسری کے تاثرات شروع ہو جاتے ہیں۔ بہر حال دونوں صورتوں میں زخم کی ٹیس کا احساس نہیں ہونے پاتا۔

انسان عالم آخرت کی گتھی سلجھانے سے اب تک قاصر رہا ہے۔ خیال کرتا ہے کہ یہ حجابوں کی دنیا ناقابل انکشاف ہے۔ لیکن اس لئے ابھی تک اسپتال کی

ترکیب پر غور نہیں کیا۔ اس میں عالم کون و مکان اور عالم عجبیٰ دونوں موجود ہیں اور ان دونوں کے درمیان آپریشن کی منزل گویا موت کی منزل ہے۔ اس لئے موت کا مزہ روحوں سے پوچھنے کی کوشش مت کرو۔ بلکہ آپریشن شدہ مریضوں سے پوچھو۔ میں اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ موت آپریشن کے عمل کی طرح محسوس نہیں کی جاسکتی مگر دونوں کے ابتدائی مراحل ہوش اور بیہوشی کی کشمکش کی وجہ سے بے حد تلخ ہو جاتے ہیں اور اس وقت انسان کی وہ کیفیت ہو جاتی ہے جو مل کے دوپٹہ کو بیری کے درخت پر پھیلا کر کھینچنے سے ہوتی ہے۔ ایک عرصہ کیلئے مریض سکوت کی ایک گہری فضا میں ماسنس لیتا ہے جہاں اس کے تمام احساسات رفتہ رفتہ مردہ ہو جاتے ہیں۔ بیہوشی کے ایک لامتناہی وقفہ کے بعد مریض کی آنکھ کھلتی ہے۔ اپنے سر ہلنے وہ یا تو حوروں کو کھڑا دیکھتا ہے اور یا نرسوں کو۔ وہ گھبرا کر پکار اٹھتا ہے۔ کہ میں کہاں ہوں۔؟ جنت میں یا اسپتال میں۔ لیکن مٹا اس کی نظر آلہ تیش پیم پر جاتی ہے اور وہ خیال کر لیتا ہے کہ میں اسپتال ہی میں ہوں۔ کیونکہ حوروں کے پاس یہ آلہ نہیں ہوتا۔ جنت کی دنیا سرد ہے۔ وہاں حرارت اور تیش کا کیا کام اور جذبات کے بخار سے کیا واسطہ؟

کوئی عورت حور نہیں بن سکتی۔ کیونکہ اس میں عمر کا لامتناہی سلسلہ درکار ہے لیکن ہر عورت نرس بن سکتی ہے۔ بشرطیکہ اس کے پاس جوانی۔ دلداری اور

الہ تپش پیا ہو۔ بد صورت نرسیں مریض کی آنکھوں میں تنکے کی طرح کھسکتی ہیں اور بوڑھی نرسیں ایک لاعلاج مرض کی طرح اس کے سر پر مسلط ہو جاتی ہیں۔ جن سے چھکارا پانے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ دونوں میں سے کسی ایک کی موت ہے۔ بشرطیکہ فوری ہو۔ نبض کی رفتار سے قلب کی حرکت اور درجہ حرارت سے جذبات کے آثار چڑھاؤ کا پتہ لگالینا اس کا اہم فریضہ ہے اور اس لئے مریض کی قلبی کیفیات اس کے سامنے آئیں ہو جاتی ہیں خواہ وہ (مریض) زبان سے اس کا تذکرہ کرے یا نہ کرے۔ اسی لئے وہ مریض کے معاملہ میں مخصوص طریقہ سے روشنی میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ معذور مریضوں کے لئے دوا۔ تندرست مریضوں (نایاب نہیں ہیں) کے لئے ٹانگ اور ڈاکٹروں کیلئے آلہ تفریح ہے۔

مریض ہسپتال میں داخل ہوتے ہیں اور مرنے یا صحت پانے کے بعد وہاں سے خارج کر دیئے جاتے ہیں۔ لیکن وہ مریض کے بستر کی طرح ہسپتال ہی میں قائم رہتی ہے۔ بشرطیکہ خود مستغنی نہ ہو جائے۔ مگر ایسی صورت شادی سے پہلے یا اس کے آثار نمودار ہوجانے کے بعد ہی رد نما ہوتی ہے۔

دکھی داسی (نرسیں) بالک داسی (استمانی) اور دیو داسی (راہم) گوا ایک دوسرے سے مختلف فرائض انجام دیتی ہیں۔ لیکن ایک لحاظ سے صورت مشترک رکھتی ہیں۔ یعنی ان سب کا ظاہر باطن ایک ہے۔ اور

ان کے لئے گھر اور باہر کچیاں۔ مخصوص طریقے سے نرس از دو حاجی جگر بند یوں کی قانونی صورت سے آزاد ہے۔ اس لئے اس کی تمام تر توجہ ہسپتال ہی پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ کمسن مریض اس کی اولاد۔ مٹن مریض اس کے والدین اور نوجوان مریض اس کے منگیتر۔ اس لحاظ سے وہ سدا سہاگن کہی جاسکتی ہے۔ لیکن چونکہ اس کی مسرت کے وقفے بے حد قلیل ہوتے ہیں اس لئے وہ دراصل بیوہ سلسل ہی ہے۔ سفید لباس اس امر کی مزید تائید کرتا ہے۔

جیل کی طرح ہسپتال بھی انسانی کمزوریوں کی تماشہ گاہ ہے جہاں اس کو اپنے گناہوں کا کفارہ زندگی ہی میں ادا کرنا ہوتا ہے۔ ان دونوں کے مجرموں میں فرق اتنا ہی ہے کہ ایک انسانی قوانین ٹوڑتا ہے اور دوسرا فطرتی۔ پہلے کی سزائیں مگر غیر یقینی ہوتی ہے۔ اور دوسرے کی سزائیں متعین مگر یقینی۔ یہی وجہ ہے کہ پولیس کبھی کبھی رشوت لے کر مجرم کو آزاد کر دیتی ہے۔ لیکن جراثیم کبھی رشوت نہیں لیتے۔ موت اور زندگی کی اس کشمکش میں تہذیب کی نقاب پارہ پارہ ہو جاتی ہے اور انسان اپنے اصلی رنگ میں نظر آنے لگتا ہے۔ فطرت انسانی کی اس عریانی کا مشاہدہ کرنے والی اس وقت نرس ہی ہوتی ہے کیونکہ ڈاکٹر کے مقابل میں اس کا ہر وقت مریضوں کی صحبت میں

زیادہ گزرتا ہے۔

اس تماشا گاہ میں یہی ایک ایسی ہستی ہے کہ جو بلا ٹکٹ نہیں بیٹھتی بلکہ ایک بڑی قیمت ادا کرتی ہے اور وہ اس کی ہمہ وقت تیار ہند ہے کہ ادھر بن دیا یا اور ادھر وہ قسم کا جال لے کر موت کا شکار کرنے نکل کھڑی ہوئی اور اپنے ماحول کے سوز کو اپنی فطرت کے ساز سے شکست دینے لگی۔ درد و آلام کی چیخوں اور آنسوؤں کے سیلاب میں وہ پیدا ہوتی ہے۔ اور وہیں مر بھی جاتی ہے۔ اگر وہ مریضوں کے نالوں کا جواب تمہلوں سے نہ دے تو ان کی ایک ہی چیز اس کی زندگی کے لہجوں کو ختم کر دینے کے لئے کافی ہے۔ وہ رونا فراموش کر دیتی ہے۔ کیونکہ اس کے غم کا کوئی شریک نہیں، البتہ وہ اپنی زندگی کا فلسفہ

”میں نے اک بے خوف نہی میں غرق کیا طوفانوں کو“

قرار دے لیتی ہے۔ کیونکہ سب کا غم اسی کے لئے ہے۔ البتہ اُس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ اس کے قہقہے قلب کی گہرائیوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ بلکہ وہ دوا کے کڑے گھونٹ کی طرح حلق سے نیچے اترتے ہی نہیں۔ اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ تیسرے درجے کی مشین بن کر رہ جاتی ہے۔ یا جنت کی حور جو ضمیمہ عاری اور جذبات سے خالی ہوتی ہے۔ وہ ایک ایسی شراب کی بوتل ہے۔ کہ جس کے منہ سے

کاگ اڑ گیا ہو۔ اس لئے وہ زندوں کے جام میں انڈیلی نہیں جاسکتی۔ بلکہ مریضوں کے حلق میں ٹیکائی جاسکتی ہے۔

مثبت، مریض، نرس اور ڈاکٹر کے دو مصلع ہم کھینچ چکے ہیں رہ گیا تیسرا مصلع، سو وہ اس قدر اہم ہے کہ ہم اگر اس سے قطع نظر کر لیں، تو ہمارا مثلث نامکمل ہی رہ جائے گا۔ اس کی تکمیل کیلئے ہم کو ڈاکٹر کی خشت اول یعنی میڈیکل کالج کے طالب علم کی طرف متوجہ ہونا پڑے گا۔

یوں تو ہر طالب علم اختلاف دماغ کا شکار ہوتا ہے۔ اور ہر اس عورت کو کہ جو اس کے قریب سے گزر جاتی ہے محبت کا پیام دے بیٹھتا ہے لیکن میڈیکل کالج کا طالب علم اس کلیہ سے مستثنیٰ ہے۔ مشق کے ابتدائی دور میں جب وہ پہلی مرتبہ انسانی لاش کو دیکھتا ہے۔ تو اس کے قریب مسرت اور خوف کے جذبات لے کر جاتا ہے۔ بالکل اس بچے کی طرح جو ربڑ کے سانپ کو خرید کر کلکاریاں بھی مارتا ہے لیکن اس کو چھوتے ہوئے ڈرتا بھی ہے۔ کہ مبادا کاٹ نہ کھلے رفتہ رفتہ خوف دور ہوتا ہے اور وہ بچہ سانپ کا منہ پکڑ کر اس کو اپنے منہ میں رکھ کر چوسنے لگتا ہے۔ اسی طرح ہمارا نوجوان ڈاکٹر بھی مردہ جسم کو کرید کرید کر دیکھتا ہے۔ یہاں تک کہ کوئی چیئر

دیکھنے کے قابل رہتی ہی نہیں، اس کے بعد اس کی نگاہوں میں انسان کا جسم اتنا ہی معمولی ہو جاتا ہے۔ کہ جیسے انجینیئر کی نظروں میں ٹوٹی ہوئی مشین۔ وہ عورت کو ایک زندہ لاش سمجھتے لگتا ہے۔ اور اس میں افعال الاعضاء کے نقطہ نظر سے دلچسپی لیتا ہے۔ اس لئے ہسپتال کی ہپارڈیواری میں نرسوں اور نوجوان ڈاکٹروں کے تعلقات پر بحث مت کرو۔ کیونکہ یہ مسئلہ خالص طبی ہے۔ جذباتی نہیں اگر وہ آپریشن کرتے کرتے تھک جاتا ہے تو اس ہندوستانی معا کی طرح جو دیوار پر چند انیٹیں چنے کے بدلے ایک کش لے لیتا ہے۔ وہ بھی نرس کا بوسہ لے لیتا ہے۔ لیکن اس امر کی ذمہ داری اس پر عاید نہیں ہوتی کہ اس بوسے کی آواز سے میز پر پڑا ہوا مریض یکایک چونک پڑے اور خود کو ذبیح اللہ کے گوسفند کی طرح کشتہ دیکھ کر حواس باختہ ہو جائے۔ قانون بھی ایسے ڈاکٹر کو مجرم نہیں ٹھہرا سکتا۔ اس لئے کہ جراثیم نہ تو رات کو سوتے ہیں، نہ اتوار کو گر جاتے ہیں اور نہ گرمیوں کی تعطیل میں پہاڑوں پر سفر کرتے ہیں۔ امتحان کر کے دیکھا گیا ہے کہ آپریشن کے وقت اگر ڈاکٹر کے پاس نرس موجود نہ ہو تو وہ عالم اضطراب میں کچھ کا کچھ کر جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ٹانگے لگاتے وقت زخم میں سے اپنے آلات تک نکالنا بھول جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹروں کی طرح اور دوسرے پیشہ ور کہ جو دن رات سخت دماغی انتشار میں مبتلا رہتے ہیں ان کو نرسوں کے بجائے لیڈی ٹائپسٹ، لیڈی کلرک اور لیڈی سکرٹری کے بغیر چارہ نہیں۔

(ساقی)

صدائے بازگشت

لکھنؤ میں ہمارے ایک دوست کی شادی تھی جس میں شرکت کرنے پر ہم اس قدر مجبور ہو گئے کہ اگر ہم رخصت بھی فرما جاتے تب بھی وہ ہم کو نہ چھوڑتے۔ اور کسی بزرگ عامل سے تعویذ لے کر فقیہ کے ذریعہ ہماری رخصت کو خواہ وہ عالم بالا میں ہوتی یا عالم اسفل میں بہر حال طلب ہی کر لیتے۔ دعوتی رقعہ کے بجائے وہ عزرائیل بن کر خود ہمارے لینے کو آئے۔ دل تو یہی چاہتا تھا کہ شادی کا لطف اٹھائیں اگر اپنی نہ سہی تو دوسرے کی سہی اور اس بہانے سرزمین اودھ کے ایک مایہ ناز شہر کی زیارت بھی کر لیں۔ مگر پس و پیش اس لئے کر رہے تھے کہ ممکن ہے ہم سے دوران قیام میں کوئی ایسی غلطی نہ سرزد نہ ہو جائے جو وہاں کی نازک طبیعتوں پر بارگزرے اور ہم دیہاتی کہلا لیں۔ مجبوراً ہم کو جانا پڑا۔ اور خدا کا شکر کہ ہماری تہذیب لکھنؤی تہذیب سے ٹکرائی نہیں۔ رسم شادی بخیر و خوبی ختم ہو گئی اور اسی کے ساتھ ہماری مدت قیام بھی قریب الختم آگئی۔

دہائی کی آخری شب بھی۔ کیونکہ صبح کو ہمارا کوچ تھا۔ ہمارے دوست

نے ہمارے سونے کا انتظام زنانی مجلس کی کشادہ چھت ہی کے اوپر کر دیا تھا۔ جہاں ان کے قریبی رشتہ دار اور عزیز پہلے سے سویا کرتے تھے پیمپیں تیں پلنگوں کے بیچ میں ہمارا پلنگ اور سوئیچ برقی اور عورتوں کے اوپر چھت تھی۔ تمام لوگ شادی کی ہنگامہ ساریوں میں متواتر مصروفیت کی کی وجہ سے خستہ ہو کر جلد ہی سو گئے۔ اور اس طرح اینڈ اینڈ کر سوائے کہ سرد پانی خبر ہی نہ رہی۔ یہی حال ہمارا بھی ہوا۔

تقریباً دو بجے ہماری آنکھ کھل گئی۔ سارے مکان پر سناٹا تھا۔ اس طرح کہ سکوت کا ایک سمندر معلوم ہوتا تھا۔ جس میں خراٹوں کی ہلکی ہلکی آواز کبھی کبھی بلند ہو کر موجوں کی ایک مثال قائم کر دیتی تھی۔ پارچ کا مینہ تھا۔ ہلکی ہلکی خنکی تھی، تیرہویں رات کا چاند بام آسمان پر پوری آب و تاب کے ساتھ چمک چمک کر ٹھنڈے ٹھنڈے نور کی بارش کر رہا تھا۔ جس میں گرد و پیش کی سفید سفید چادریں ایسی غائب ہو گئی تھیں کہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک تمام چھت خالی ہی نظر آتی تھی۔ ڈھول، تانہ، باجا، گانا اور غل بچکے بعد یہ قیامت خیز سکون دل پر ایسا چھایا کہ ہم کھو گئے۔

”حکے حیدر جاگتے رہاؤ“..... نے ہمارے استغراق کو ختم کر دیا شاید کسی رئیس کی ڈیوڑھی کے محافظ کی صدا تھی۔ جس کی دلکش باز نشست نے ہماری عنان توجہ کو اپنی طرف موڑ لیا۔ اس کی ملائیمیت، شیرینی، صحیح تلفظ

اور باقاعدہ تارچڑھانے ہمارے دل میں ایک تزلزل پیدا کر دیا۔ تھی تو ایک معمولی چوکیدار کی آواز مگر اس خاص موقع پر سکوت شب کو توڑتی ہوئی ٹھنڈی فضا میں پھیلتی ہوئی اور چاندنی کے لطیف تاروں سے ٹکراتی ہوئی۔ میرے کانوں میں اس طرح درا آئی جس طرح جلتے رنگ کا ساز۔

معا میرے خیالات لکھنؤ کے گذشتہ عروج و اقبال کی طرف مڑ گئے آہ ایہ آواز اسی زلزلے کی ایک یادگار ہے جو آج کل کے اجڈ اور بھدے سپاہیوں کی ڈوانی آواز سے جس کو سن کر معصوم بچے اپنے اپنے بستروں سے ایک خوفناک تڑپ کے ساتھ اچھل پڑتے ہیں کس قدر مختلف ہے۔ وہ کتنا اچھا زمانہ ہوگا جبکہ اس شہر کے ہر چرگی کو چسے سے یہی صدائیں بلند ہوتی ہوں گی۔ مغلیہ سلطنت کے سطوت و جبروت کے بعد پھر وہ زمانہ بھی غنیمت ہوگا جبکہ اس مردم خیز خطہ پر یہاں کے نازک مزاج بادشاہ اپنی آن بان کے ساتھ حکومت کرتے ہوں گے۔ دکن میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان میسور کے پہاڑوں میں اپنے شیرانہ نعروں سے اسلام کی گونج پیدا کر رہے ہوں گے اور سندھ کے گت ریتوں میں وہاں کے امیر اپنی فطری سادگی اور بے تکلفی سے ہندوستان میں شیریں کی سادگی کی یاد دلا رہے ہوں گے۔ کاش ہمارے پاس ہمارے پورے دل کے چند ٹکڑے ہی باقی رہ جاتے..... ”حکے حیدر۔ جاتے رہو او...“ کی آواز پھر بلند ہوئی اور فضائے بسیط میں محور کے گرد محور بناتی ہوئی ایک ہلکی

سی گونج میں تبدیل ہو کر میرے کانوں کے پردوں پر پھر آ کر ٹکرائی اور میرے دل کی گہرائیوں میں اترتی ہوئی کھو گئی۔

آہ! کتنی شیریں آواز ہے کاش میں ایسی آواز والا سپاہی ہوتا یا اسی آواز کا ریکارڈ میرے گلے میں اتر جاتا کیا میں اپنی آواز میں بھی اسی طرح کا لوح، گونج اور پاٹ پیدا کر سکتا ہوں اور کیا میں اسی طرح بعینہ اسی طرح آواز لگا سکتا ہوں....؟ یہ سوالات تھے جو میں تکیہ پر سر رکھے ہوئے اپنے دل سے کر رہا تھا۔ اس وقت میں خود فراموش تو نہ تھا البتہ کل فراموش تو ضرور تھا۔ اہ! اس وقت میری آواز کی گونج کتنا لطف دیگی؟ میں نے خیال کیا۔ کنکھار کر اپنے گلے کو صاف کیا اور وہیں بستر پر لیٹے لیٹے سر کو ذرا اونچا کیا اور حکے حیدر جگتے رہو کی ایک بے تحاشہ آواز نکالی جو بجائے سریلی اور لچکدار ہونے کے جھنکار پیدا کرتی ہوئی مکان کی قلعہ نما دیواروں تک ٹکر کر ایک ایک اینٹ میں لرزہ پیدا کر گئی.....

آہ! یہ میں نے کیا کیا؟ میں اچھل پڑا کیونکہ ادھر آواز کا میرے منہ سے نکل کر پھیلنا اور ادھر میرے قرب و جوار کے سونیوالوں کا ہڑبڑا کر گیا ہے؟ کیسا ہے؟ کہتے ہوئے بستر پر سے کود کود کر اچھلنا اور نیچے صحن میں عورتوں اور بچوں کا یکایک بیدار ہو کر دھوکا پیدا کرنا میرے لئے سوہان روح ہو گیا۔ کاش یہ میرے منہ سے نکلی ہوئی آواز میرے حلق میں پھر واپس آ جاتی۔

”آخر آپ کو یہ کیا سوچھی؟.....“ مجھ پر سوالوں کی بوچھاڑ تھی۔ ”اے لوگو یہ کون سی شرارت تھی کہ مونی جان کو ہلکان کر دیا۔ آخر ہیں نادہیا تھی؟ عورتیں چمگوتیاں کر رہی تھیں..... اچھن، بنن، اغن، ذرا دریافت تو کرو یہ ہوا کیا؟“ بڑی بوڑھیاں احکام دے رہی تھیں۔ ”ہے ہے کلیجہ کانپ رہا، باجی بالٹا ہاتھ رکھ کر دیکھئے کیسا دھڑ دھڑ کر رہا ہے۔“ لڑکیاں التجا کر رہی تھیں.... ”امی جان! ہمیں لپٹا لیجئے ڈر لگتا ہے۔“ بچے رونی آواز میں کہہ رہے تھے۔ اور جناب آپ نے غضب کر دیا۔ میں احتجاجی مریض، کن دقتوں کے بعد سویا تھا۔ بس اب نیند کا خدا ہی حافظ ہے۔“ ایک ضعیف لہجہ میری جان کو رو رہے تھے اور ہم سر جھکائے ہوئے۔ دل کو ایک ہاتھ سے پکڑے ہوئے اور دوسرے ہاتھ سے اپنے کاپسینہ پوچھتے ہوئے پلنگ کی پائنٹی کی طرف منہ کئے دم بخود بیٹھے ہوئے تھے۔ اتنے سوالات کا ایک وقت کس طرح جواب دیتے اور اگر دینے کی کوشش بھی کرتے تو زبان کس کے منہ میں تھی؟

(ساقی)

جہنمی کے مکان!

ہم ترین سے اترتے ہی سیدھے وہاں پہنچے جہاں ہمارے ایک دوست رہتے تھے۔ بعد تلاش بسیار جب ان کی جائے قیام کا پتہ مل گیا تو ہم اس بلڈنگ میں داخل ہوئے اور زینے پر چڑھنے لگے۔ قطب مینار ہم ایک بار دیکھ آئے تھے اور جوشِ عمل میں بیڑہیوں کو طے کرتے ہوئے اس کے عرش تک بھی پہنچ گئے تھے۔ لیکن اترتے وقت زمین ہم کو اس سرعت کے ساتھ کھینچ رہی تھی کہ ہم تیزی رفتار کے لحاظ سے کبھی ہوائی معلوم ہوتے تھے۔ جی ہاں! اس وقت زینہ کی چڑھائی نے ہم کو قطب مینار کی یاد دلادی اور اس گھاؤ اور پھراؤ نے آصف الدولہ کے امام باڑہ کی بھول بھلیوں کو۔

رات کا وقت تھا۔ گرد و پیش کے تمام کمروں میں بجلی کی قییاں روشن تھیں معزز اور شریف عورتیں اپنے اپنے کاموں میں اور بچے اپنے کمرے کے سہانے اپنی معصوم تفریحوں میں مشغول تھے۔ آپ خیال فرما سکتے ہیں اس شخص کی حیرت کی انتہا کہ جو ایسے مقام سے آ رہا تھا جہاں کے مکانوں کی دنیا ہی بالکل علیحدہ ہے۔ جہاں ایک اجنبی کے لئے مکان کے اندر کا سین دیکھ دینا ناممکن ہے۔

بشرطیکہ وہ چور، پولیس اور مہمان نہ ہو۔ سرکک پر چلنے والوں کے لئے گرد و پیش کی دیواریں حد نظر ہو جاتی ہیں اور مکان کے اندر رہنے والوں کی دنیا صحن اور کمروں میں محدود ہو جاتی ہے۔ البتہ کشادہ صحن، تازہ ہوا اور سوچ کی روشنی پر مکان کی ساخت کے مطابق بلا شراکت غیر سے قبضہ نہ رہتا ہے اور فضا میں ہمسایہ کی آنکھ اور کان کو دخل اندازی کرنے کا کوئی حق نہیں دیا جاتا۔

ہم کو کیا معلوم تھا کہ یہ چند منزل کی عمارت جس میں سینکڑوں کمرے ہیں ان میں سینکڑوں خاندان بھی فروش ہیں اور ان کے اترنے اور چڑھنے کا زمینہ بھی ایک ہی ہے۔ ہم نے اپنے روایتی اصول کے مطابق کہ پردہ دار کو دیکھتے ہی یا تو فوراً گھوم جایئے اور یا آنکھوں پر رومال، ہاتھ، ٹوپی وغیرہ کی اوٹ کر لیجئے۔ ہم نے اپنی آنکھوں پر رومال رکھ لیا تا کہ ہم سوائے زمینہ کی سیڑھیوں کے اور کچھ دیکھ نہ سکیں۔ مگر اس کے باوجود ہمارے دل میں جھجک پیدا ہوئی تھی اور دماغ میں شکوک۔ خیال یہ تھا کہ یہ مخصوص طریقے سے زندہ مکان ہیں اور یہ زمینہ بھی عورتوں ہی کے لئے مخصوص ہے۔ شاید ہمارے دوست تک پہنچنے کا دوسرا راستہ ہو جس کا ہم کو علم نہ ہو، یا ممکن ہے کہ کسی ذات شریف نے اجنبی خیال کر کے مذاق کیا ہو اور یہ غلط راستہ بتا دیا ہو، ایسا نہ ہو کہ دلس میں ذلت ہو اور اُس موئے کو نکالو، کہاں گھسا آتا ہے“ کی صداؤں سے پلپٹا ہوا پاڑے۔

بہر حال چونکہ دو منزلیں طے کر آئے تھے اور اسی دوران میں کوئی ناگوار واقعہ
 بھی ظہور پذیر نہیں ہوا تھا اس لئے ہمت کر کے آگے بڑھے ہی گئے۔ لیکن اس
 احتیاط کے ساتھ کہ آئرن فرنٹ ہی رہیں۔ مگر تیسری منزل پر پہنچنے کے بعد ہم
 نے خود کو یکایک ایسی جگہ پایا جہاں قرآن سے معلوم ہوتا تھا کہ عورتوں کی ایک
 بڑی مجلس منعقد ہونے والی تھی۔ کیونکہ کمرؤں کے باہر فرش بچھا ہوا تھا اور
 اس پر عورتوں کی ایک بہت بڑی تعداد بیٹھنے اور کھڑے ہونے کی مختلف
 کیفیتوں کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ شاید آپ کو معلوم ہو کہ دنیا کی تمام چیزیں تماشہ
 کہی جاسکتی ہیں۔ لیکن برات۔ جنازہ۔ مار پیٹ۔ پاگل اور نبرد مخصوص طریقے
 سے تماشہ ہیں مگر جس قدر ایک اجنبی میں تماشہ بننے کی صلاحیت موجود ہے
 اتنی کسی اور ہستی میں نہیں۔ دوسرے ملک اور شہر میں جا کر وہ ایک عجیب الخلقت
 انسان بن جاتا ہے۔ میں خود کو ایسی حالت میں پا کر ارادۂ ایک پنواڑی کی
 دوکان کے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھ لیا کرتا تھا تاکہ معلوم کروں کہ میری ناک سونڈ
 تو نہیں بن رہی ہے۔

چنانچہ میں اس وقت اس عمارت کی تیسری منزل پر ایک متحرک تماشا
 تھا جو حاضرین کو بلا ٹکٹ دکھایا جا رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں فلم کی سی سرعت
 کے ساتھ زینے کی سیڑھیوں کو طے کر رہا تھا تاکہ یہ سین طویل نہ ہو جائے اب
 بد قسمتی کو کیا کیا جائے کہ میں طرح پر دہ سینما پر فلم کو یکبارگی ایک حادثہ

پیش آجاتا ہے۔ اسی طرح مجھ کو بھی ایک حادثہ سے دوچار ہونا پڑا اور نتیجہ یہ ہوا کہ میری قوت زقار سلب ہو گئی۔ وجہ یہ تھی کہ آٹھ عورتیں زری کے لباس میں بلوس ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چوتھی منزل کے زینے سے تیسری منزل پر آ رہی تھیں اور میں تیسری منزل سے چوتھی منزل پر جا رہا تھا۔ ان کا اور میرا اس وقت مقابلہ ہوا ہے میں نہیں کہہ سکتا کہ میری کیا حالت تھی۔ ایک نوجوان جس کی پرورش و پرداخت حرم کی طرح سب سے علیحدہ ہوئی ہو اس وقت سولہ آنکھوں کا رخ اپنے ہی چہرے کے نقطے پر جما ہوا دیکھ کر کس طرح نہ گھبرا جاتا۔ خود ہی میرا منہ مڑ گیا۔ پیرتیز ہو گئے اور بجائے چوتھی منزل پر جانے کے میں تیسری منزل سے دوسری منزل کی طرف چلا جا رہا تھا۔ میرے کانوں میں سات آٹھ سُرور سے ملے ہوئے ایک لطیف نغمے کی آواز آرہی تھی، مگر میں اترتا ہی جا رہا تھا۔

اتفاق ایسا ہوا کہ اس گھبراہٹ میں میں سینی سے اتر رہا تھا اور ایک دوسرے صاحب تیزی سے زینے پر چڑھ رہے تھے۔ ریل گاڑی کے انجنوں کی طرح میں اور وہ ٹکرائے۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں دھڑام سے گرنے اور فٹ بال کی طرح گدے کھلتے ہوئے پہلی منزل کے زینے پر مشکل آکر رُکے۔

جب میرے ہوش دواں بجا ہوئے تو میرے تعجب کی کوئی انتہا

نہ رہی جب میں نے انہیں دوست کو اپنے سامنے کھڑا ہوا پایا جن کی تلاش
مجھے مقصود تھی۔ وہ میرا ہاتھ پکڑے اسی طرف پھر واپس لئے جا رہے
تھے جہاں سے میں ایسی سرکاری میں بھاگا تھا۔

(السلام)

دیا سلائیوں کا قحط

اگر آپ تاروں کو شمار کر سکتے ہیں تو دیا سلائیوں کا شمار بھی ممکن ہے اور اگر دیا سلائی کی ڈبیوں کے ٹریڈ مارک جمع کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے پورا محکمہ قایم کرنا پڑے گا۔ لندن میوزیم کی طرح اس کی فرست ایک بہت بڑی فائوس بن جائیگی جو عجائب المخلوقات سے کسی طرح کم نہ ثابت ہوگی۔

ایک زمانہ تھا جبکہ دیا سلائی بہت حقیر سی شے تھی۔ میں اس بے تکلفی سے سنس لیتا ہوں اسی بے تکلفی سے دیا سلائیوں بھی جلا سکتا تھا۔ کیونکہ ہوا کی طرح یہ بھی سارے عالم پر چھائی ہوئی تھیں۔ فرض کیجئے کہ ہمیں سگریٹ سلگانا ہوتی تو ہم ایک دیا سلائی اس لاپرواہی سے روشن کرتے تھے کہ وہ فوراً بجھ کر کوڑھ جاتی تھی۔ اس کے بعد ہم دوسری کو شش کرتے تھے۔ اور جتنی ہوئی دیا سلائی کو سگریٹ کے پاس لانا ہی چاہتے تھے کہ فوراً ہمارے قریب بیٹھے ہوئے دوست کے سر پر شیطان سوار ہو جاتا تھا اور وہ اس شعلہ پر اپنے تنفس کی قوت کو آزمائے کے لئے بس ایک ہلکی سی پھونک مار دیتے تھے اور وہ دیا سلائی بجھ جاتی تھی۔ ہم کو بھی ضد آ جاتی تھی۔ ہم جلانے کی کوشش

کرتے تھے اور وہ پھونکنے کی۔ یہاں تک کہ کشتوں کے پستے لگ جاتے تھے اکثر اوقات سگریٹ سلگانے کے مقابلے بھی منعقد کئے جاتے تھے۔ بالکل ٹیڑوں پتنگوں اور مرغوں کے مقابلوں کی طرح یہ مقابلے خاص طور سے ایسی موثر پر بیٹھ کر کئے جاتے تھے جس کا غرہ (ہڈ) گرا ہوا ہوتا تھا اور وہ تقریباً ستر میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جا رہی ہوتی تھی جسرت رہ گئی کہ ہوائی جہاز کے عرشہ پر یہ مقابلہ منعقد نہیں کیا جاسکا۔

دیا سلائیوں کی ہوائیاں چھوڑنا بھی لطف سے خالی نہ تھا۔ دیا سلائی کا سراس کے کبس پر چسپاں شدہ ریت کا غز پر دکھا اور انگوٹھے سے آہستہ سے دبا کر تیر کی طرح چھوڑ دیا۔ دیا سلائی ہنومان کی دم کی طرح جلتی ہوئی دور جا کر گرتی تھی۔ اور اگر رات کا وقت ہوتا تھا تو بالکل ٹوٹا ہوا سا معلوم ہوتی تھی۔

دیا سلائیوں کے معاملے میں میری یہ فضول خرچی ایسی تھی کہ گویا تمام دنیا ان سے بھری ہوئی ہے اور میں ان کو جلا کر دوسری چیزوں کے لئے جگہ پیدا کر رہا ہوں کیونکہ ایک پیسے میں اکثر دو کبس مل جانا کوئی بات ہی نہ تھی۔ اگر اتفاق سے جیب دیا سلائی سے خالی اور سگریٹ سے بھری ہوتی تھی تو اس کو خریدنا معیوب تھا۔ ہم کسی راہگیر سے اس کا کبس اس بے تکلفی سے مانگ سکتے تھے کہ جس طرح اس سے دقت پوچھ سکتے تھے۔ اس زمانے کے راہگیر بھی اس

قدحیر چشم ہوتے تھے کہ پورا اکس ہم کو سپرد کر کے تو دانی حساب کم و بیشیں اکتے ہوئے آگے بڑھ جاتے تھے۔ اگر ہم نے پہلی ہی کوشش میں سگریٹ منگوالی تو ہماور نہ دوسری کوشش کے نتیجہ کا انتظار کئے بغیر وہ ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے تھے اور وہ بکس مال غنیمت کی طرح ہمارے حصہ میں آ جاتا تھا۔

میں کثیر الاحباب ہوں اور اسی لئے جب میں مکان واپس آتا تھا تو میری جیبوں سے دیاسلائیوں کی ڈبیاں برآمد ہوتی تھیں۔ معاف کیجئے اس مقام پر آپ میری نیت پر حملہ نہ کیجئے گا۔ دراصل واقعہ یوں ہے کہ خالی ہاتھوں اور چلتی ہوئی زبان کے لئے دیاسلائی کا بکس ہنرین ساز کا کام دیتا ہے بشرطیکہ خالی نہ ہو جس وقت آپ اپنے دوست سے رخصت طلب کرتے ہیں اس وقت ہاتھوں کو مصافحہ کے واسطے تیار کرنے کے لئے آپ ان کو غیر ارادی طور سے اپنی کوٹ کی جیبوں میں ڈال کر نکال لیتے ہیں۔ کج نیت ڈیادہیں رہ جاتی ہے لیکن اگر آپ یہ خیال فرمائیں کہ اس طرح حامل شدہ ڈبیوں سے آپ کے باور چھپانے کے بجٹ میں کچھ کمی آ جاتی ہو تو غلط ہے کیونکہ اس ہاتھ لینا اور اس ہاتھ دینا کے اصول پر وہ بیوفا ڈبیاں آج میری جیب میں مفور ہو کر چلی آئیں تو کل شرطیہ میرے دوستوں کے ساتھ چلی جائیگی۔

اس زمانے میں کہ جس کا ہم مرثیہ پڑھ رہے ہیں ڈبیاں جنگی سائری ہوتی تھیں۔ مخصوص طریقے سے سوئڈن کی ڈبیاں مارواڑی کی تھیلی کی طرح،

گہری ہوتی تھیں۔ ان کے علاوہ دیاسلایوں میں اس قدر برکت ہوتی تھی کہ ایک ڈبیہ ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی حالانکہ دیاسلانی ہم پہلے جلاتے تھے اور بات پیچھے کرتے تھے۔ مخصوص طریقے سے ہماری مائیں باورچی خانے میں کپیاں جلاتی تھیں اور صحن کی طویل منزل طے کرنے کے لئے ان سے مشعل راہ کا کام لیتی تھیں اور خوفناک گوشوں میں جانے کے وقت طلسمی قلیوں کا کہ جن کی رو اور دھویں سے بھوت ہوا ہو جاتے تھے۔ یہ کپیاں مچھروں کی طرح ہوا کے سامنے مشکل سے بھرتی تھیں اس لئے راستہ بھران کا وظیفہ مسجد کا چراغ گل نہ ہونا رہتا تھا۔ لیکن مسجد کا چراغ گل ہو جاتا تھا اور اس تمام مہم میں معلوم کتنی دیاسلایاں جلادی جاتی تھیں۔

اب چند دن سے دیاسلایوں کا کال پڑ گیا ہے۔ آج کل ڈبیاں اس ڈبلی تیلی ہوتی ہیں کہ پرانے زمانے کے کبسوں کے مقابلے میں اچھی کیس معلوم ہوتی ہیں۔ ان میں دیاسلایوں کی تعداد بھی گنی جینی رہ گئی ہے جس طرح قیامت کے زمانے میں مومنوں کی تعداد گھٹ کر چالیس رہ جائیگی اسی طرح آج کل ایک ڈبیہ میں صرف چالیس ہی دیاسلایاں باقی رہ گئی ہیں گویا ان کی آبادی میں قیامت آچکی۔ اول الذکر کی توجیہ اس طرح کی جاسکتی ہے کہ ممکن ہے قیامت کے قریب مومنوں میں ضبط تولید کی تحریک شروع ہو جائے لیکن آخر الذکر کی کمی کا سبب یہ نہیں قرار دیا جاسکتا۔

جس طرح کا رد اور لفافے ہنگے ہو جانے کی وجہ سے حلقہ احباب میں تخفیف کرنی پڑی تھی اسی طرح دیاسلائیوں کے قحط کی وجہ سے سگریٹ کی تعداد میں تخفیف کرنی پڑی ہے۔ مخصوص طریقے سے بیڑی پینے والے حضرات قابلِ رحم ہیں کیونکہ بیڑی کو جتنا رکھنے کے لئے دیاسلائیاں مسلسل سلگائی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے پینے والے کے ایک ہاتھ میں سلگی ہوئی بیڑی ہوتی ہے اور دوسرے ہاتھ میں جلتی ہوئی دیاسلائی اس لئے نہیں کہا جاسکتا کہ وہ دراصل بیڑی پیتا ہے یا دیاسلائی، یا بیک وقت دونوں کا دم لگتا ہے۔

فی زمانہ راستہ میں لوگوں سے ہمدردی اور دیاسلائی کی امید رکھنا بیجا ہے۔ دیاسلائی طلب کرنا بالکل ایسا ہی ہے کہ جیسے ہاتھ پھیلا کر پیسہ مانگنا، اور اس کا دیدن یا بھی ایسا ہی ہے کہ جیسے اپنی عزت کا دنیا۔ بعض اوقات جب میری سائیکل کی تیلی گل ہو جاتی ہے اور بد قسمتی سے دیاسلائی کی ڈبیا اور کیسہ دونوں خالی نظر آتے ہیں اس وقت مجھے اگلے زمانے کی یادخون کے آنسو لاتی ہے کیونکہ ہر چور اسے پر پولیس کا سپاہی قانون کا مجسمہ نظر آتا ہے اور ہر راہرو دیاسلائی کے معاملے میں یہودی ثابت ہوتا ہے۔

یہ توخیر سڑک کا معاملہ ہے۔ لیکن خود اپنے محکمہ میں جب کبھی مجھ کو دیاسلائی کی ضرورت ہوتی ہے تو میں جس کسی سے سیدھے سادے طریقے سے طلب کرتا ہوں وہ مُنہ بنا کر رہ جاتا ہے۔ میرے ایک دوست ہیں

جو میرے قریب ہی رہتے ہیں ان سے دیاسلانی مانگنے کے لئے مجھے بہت حکمت عملی سے کام لینا پڑتا ہے۔ میں پہلے دیاسلانی کی مہتید اٹھاتا ہوں اور وہ اس طرح کہ اٹلی اور حبشہ کی جنگ کا قصہ چھیڑ کر اٹلی کی طرف داری کرتا ہوں تاکہ میرے ماژواری دوست اپنی اہمیت محسوس کر لیں۔ اور ان کی رائے کی وقعت ہو جائے۔ اس کے بعد میں سگریٹ نکالتا ہوں اور وہ مسکرا کر دیاسلانی۔ کیونکہ وہ اب جان گئے ہیں کہ مجھے ان کی باتوں سے زیادہ ان کی دیاسلانی سے دلچسپی ہے۔ لیکن وہ ایسی قیمتی شے میرے ہاتھ میں نہیں دیتے بلکہ پہلے وہ چاروں طرف سے کمرہ بند کر دیتے ہیں تاکہ دوسری دیاسلانی جلانے کی نوبت نہ آئے۔

محلے میں آج کل جو شخص پہلے آگ سنگا لیتا ہے اس کی جان عذاب میں آجاتی ہے کیونکہ تمام محلے والے اس کے چوٹے پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور گوری کے جو بن کی طرح اس کی چنگاریوں کو چٹکیوں میں اڑا دیتے ہیں۔ محفلوں میں جو شخص سگریٹ ختم کر لیتا ہے وہ اس کے ٹکڑے کو ضیاع نہیں کرتا بلکہ اس کو چنگاری کی شکل میں محفوظ رکھتا ہے تاکہ دوسرے سگریٹوں کے کام آسکے بڑے ہوٹلوں میں اب دیاسلانی کے بجائے جاپانی لمپ جلتے ہیں اور چھوٹے ہوٹلوں میں موبجھ کی رسیاں۔ بہر حال دیاسلانی کے قحط نے جاپان کی تجارت کو فروغ دیدیا ہے۔

نیو نیپلی سے التجا ہے کہ وہ پانی کے نل اور پارکوں کی طرح جگہ بجگہ
 آتشزدان بھی بنوا دے تاکہ ہم لوگ دیاسلائی کے اس قحط سے امان پائیں
 کیا یہ ممکن نہیں کہ ہولی کا ہتوار بجائے تین دن تک رہنے کے سال بھر برابر
 جاری رہے اور سڑکوں کے چوراہوں پر دن رات آتشیں مظاہرے ہوتے
 رہیں۔ ہاں ایسے موقع پر ایک قیمتی مشورہ اور بھی دیا سکتا ہے۔ ہندوستان
 میں رفتہ رفتہ تمام مذاہب تبلیغی ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ
 پارسی اس فرض سے اب تک شان استغنا پرت رہے ہیں۔ اپنی سیاسی اثر
 بڑھانے کے لئے اس زمانے سے بہتر اور کون سا موقع مل سکتا ہے جبکہ دیاسلائی
 کا قحط ہے کیوں نہیں وہ ہر جگہ آتشخانے بنوا کر اگنی مانا کا پرچار کرتے؟

(ادبی دنیا)

کنکھیاں

سڑک پر اسٹراکٹر کے نعروں کی آواز ایک ہوا کے طوفان کی طرح اٹھی جس نے دور ویر عمارتوں کی لاتعداد کھڑکیوں کے پردوں کو اس طرح الٹ دیا جس طرح آسمان پر آئی ہوئی کالی کالی گھٹا ہوا کے زور سے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر غائب ہو جاتی ہے اور آسمان کا مطلع کھلا چھوڑ جاتی ہے۔ پردوں کے ٹپنے کے بعد بجلی کے مقبول کی روشنی میں بہت سے چمکے رنگے اور عمارتوں کے آسمانوں پر چاند ہو کر چمکے لاتعداد تیز سیاہ اور چمکدار آنکھیں تھیں جو برقوں، چادروں اور اوٹوں میں سے آسمان پر چمکتے ہوئے تاروں کا سامنہ پیش کر رہی تھیں۔ سامنے کے کھلے ہوئے زینوں میں اوپر سے اترتے ہوئے چہروں اور جسموں کے باصرہ نواز مجموعے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ آسمان پر ٹوٹتے ہوئے ستاروں کی طرح اپنی برق پاشیوں سے دیکھنے والوں کی آنکھوں کو خیرہ کر رہے تھے۔ صرف فرق اتنا تھا کہ ان ستاروں کی روشنی گھٹتے گھٹتے ایک نقطہ پر آ کر تاریکی میں غائب ہو جاتی ہے اور ان ستاروں کی روشنی بڑھتے بڑھتے سامنے آ کر ٹھہر گئی تھی۔

جلوس میں کچھ ایسے لوگ تھے جو فوج کے بہادر سپاہیوں کی طرح اپنے

سرزاویہ قائمہ پر رکھے ہوئے آنکھوں کو اپنے سامنے والی سڑک کے بالکل متوازی قائم کئے ہوئے چل رہے تھے۔ کچھ ایسے تھے جو گھومتے ہوئے کیمرس کی طرح جلوس کی سرخ جھنڈیوں پر نگاہ ٹھارتے ہوئے اللہ اکبر کہتے ہوئے گرد و پیش کے لوگوں پر ہلکی سی نظر ڈالتے ہوئے اور اپنے رخ کو خوبصورتی سے قریب کی سمت کی طرف موڑ کے تارنگہ کو اوپنا بیچا کر کے ایک نقطہ پر لا کر ٹھہرادیتے تھے۔ اس طرح سے ان خاص خاص تصویروں کو اپنی ذہنی فلم پر منتقل کر کے وہ مجبوری اپنے چہرہ کو پھر کتہ اول پر لے آتے تھے اور قدم آگے بڑھتے تھے۔ کچھ ایسے تھے جن کے زاویہ نگاہ کا پتہ چلانا ذرا مشکل کام تھا۔ ظاہر میں نظروں کے لئے ان کے سر کا زاویہ قائمہ بالکل مستقیم ہی درجوں کا تھا جیسا کہ قسم اول کے بہادر سپاہیوں کا لیکن ان کی آنکھوں میں ذرا فرق تھا۔ ان کے گوشہائے چشم ایک ہی سمت کو کھینچ کر ذرا لمبے ہو گئے تھے اور آنکھوں کے ڈھیلے بجائے بیچ میں رہنے کے ڈھلک کر انھیں کھینچے ہوئے گوشہائے چشم میں آکر اس طرح چھپ کر سمت مطلوبہ کی طرف جھانک رہے تھے کہ اگر کوئی دوسری طرف سے دھجیتا تو ان کی آنکھوں کی سفیدی ہی نظر آتی۔

ہم لوگ چاروں طرف دیکھتے چل رہے تھے۔ امرتسن اور یورپی ستیا ج جو ہندوستان میں سیر کے لئے آتے ہیں۔ اپنے ملکوں میں واپس جاکر ہندوستانی عورتوں کے پردے کی بڑی شکایت کرتے ہیں۔ ہندوستان کے گوشے گوشے کے

پتھروں تک کا معائنہ وہ کر کے جاتے ہیں لیکن یہاں کے حرم کی دیواروں میں نہ تو کوئی روزن کر سکتے ہیں اور نہ یہاں کی عوا کی میٹلیوں کے چہروں پر نگاہ میں ہی موج رہا تھا کہ وہ اپنی عقل سے کام نہیں لیتے۔ ان کی شکایت بالکل بیجا ہے بہت ہی معمولی ترکیب ہے۔ جب کسی گلی یا سڑک سے گزریں اپنے ساتھ دو تین بیگ پائپ اور دو ایک ڈھول تالشیں بجاتے ہوئے چلیں۔ ان سڑکوں میں ایسی تاثیر ہے کہ ناگ اور ناگنوں کی طرح یہ آدم اور عوا کی اولادیں بے تحاشہ حجاب حرم سے نکل کر محو تماشہ ہو جائیں گی۔

خیر میں اسی خیال میں تھا کہ یکایک ہاشم نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”دیکھو ادھر!“

میرے نگاہ موڑنے سے قبل سلیم کی نگاہیں اس طرف مڑ چکی تھیں۔ میں نے تیسری منزل پر ایک شکل دیکھی جو واقعی قابل پرستش تھی۔ ہاشم نے اس کو نگاہ بھر کے دیکھا اس کی تعریف کے پل باندھے اور میرا ہاتھ پکڑ کر وہیں کھڑے ہو گئے۔ سلیم باوجود اس قدر زندہ دل ہونے کے بالکل ندر کہ اور سر نہ بچائے ہوئے آگے بڑھے گئے۔ ہاشم نے آگے بڑھ کر وہاں کو اس عجیب اور برف صفتی پر بڑبا بھلا کہا اور اپنے انتخاب پر داد کے جھگڑا ہوئے۔ ہاشم اشارہ کر کے ان کو بتا رہا تھا اگر سلیم شہر آیا جاتا تھا اور اس کے چہرے کا رنگ اڑا جاتا تھا۔

”دیکھو! وہ ہم لوگوں کو دیکھ بھی رہی ہے۔“ ہاشم نے کہا۔

اور واقعی اس کی نظروں کا رخ ہم ہی لوگوں کی طرف تھا۔ زیادہ رحمان
 سلیم کی طرف معلوم ہوتا تھا۔ ہم لوگ سلیم سے اس واقعہ کی تفصیل پوچھنا ہی
 چاہتے تھے کہ ادھر سے کسی نے آواز دی ”بھائیجان“ مڑ کر جو دیکھتے ہیں تو اس
 لڑکی کا تو کہیں تپہ نہیں لیکن اس لڑکی کی جگہ سلیم کا بھائی حسین کھڑا ہوا
 اپنے بھائی کو بلاتا تھا۔

”ارے یہ تمہارا گھر ہے؟“۔ میں نے شرمندہ ہو کر سلیم سے کہا۔ ہاشم کے
 چہرے کا رنگ فق ہو گیا اور وہ سلیم کے گم گم ہونے پر ڈال کر معافی مانگنے لگا۔
 سلیم بناوٹی ہنسی بھنسا۔ اس کے اشارے سے اثبات میں جواب دیا اور اپنی ندامت
 مٹانے کو ہم دونوں کا ہاتھ پکڑ کر اپنے زینے کی طرف لے چلا۔
 ”چلو چائے پیئیں گے!“

چائے پی رہے تھے لیکن ہم لوگ اس واقعہ کی ندامت میں خاموش رہے
 جب کبھی ہماری نظریں سلیم سے دوچار ہو جاتی تھیں تو وہ بھی شرمناک آنکھیں پینچی
 کر لیتا تھا اور ہم لوگ بھی آخر ہاشم سے نہ رہا گیا اور اس نے سکوت کو
 توڑتے ہوئے کہا۔

”کیا وہ تمہاری کوئی عزیز تھیں؟“

”ہاں، میری بہن تھی۔“ سلیم نے بناوٹی قہقہہ لگا کر کہا۔ اس کے بعد کہا۔ ”جلے بھی
 اس کا خیال، خود میرے ہی اوپر ایک واقعہ گزرا ہے۔“

ندامت کی آہنی دیواریں ٹوٹ چکی تھیں اس لئے ہم نے ان سے فرمائش کی کہ ہم آپ کا واقعہ ضرور سنیں گے کہنے لگے کہ جب آنکھوں کے سامنے کوئی چیز آئے تو لامحالہ دیکھنا ہی پڑتا ہے۔ دماغ میں خیالات کا پیدا ہونا بھی ضروری ہے لیکن ارادہ ناگھوڑنا۔ آواز سے کسنا۔ اشارے کرنا اور ہر چیز کے تعاقب میں جہاد نفسی کی دلالت ہے۔

میں نے ہاشم کی طرف دیکھا اس کا ماتھا شرمندگی کے پسینے سے تر تھا۔
 ”غیر میری بھی یہی حالت تھی۔“ سلیم نے کہا۔ ”مگر اب نہیں ہے۔ کب سے نہیں ہے اسے دو سال ہوئے۔ میری شادی تم جلتے ہی ہو کہ شمالی ہند میں ہوئی ہے وہاں عورتوں کا بہت سخت پردہ ہے۔ بند سوار یوں میں گھر سے نکلتی ہیں۔ عام رواج ڈولیوں کا ہے۔ ایک مرتبہ میں اپنی سسرال گیا اور وہاں ایک عزیز سے مل کر واپس آ رہا تھا کہ سارے میں نے ایک ڈولی اتارے ہوئے دیکھی۔ میں اس کے قریب ہی پہونچا تھا کہ وہ سڑک کے داہنی طرف مڑنے لگی۔ سامنے والے کمار کے مڑنے پر ڈولی کا اگلا رخ بالکل میری نظر کے سامنے آ گیا۔ میں نے دیکھا کہ پردے کے دونوں طرفوں کو ملا کر بیچ میں سے مضبوط پکڑا گیا تھا۔ مگر دو خانی ہو گیا یا ہر نکلی ہوئی تھیں جن کی وجہ سے پردے میں ذرا سا شکاف ہو گیا تھا۔ بس اسی شکاف میں سے میں نے دوا آنکھوں اور چہرے کے کچھ حصے کو دیکھا۔ انہیں تھیں یا واقعی موتی تھے جن کی چمک اور کشش سے میں بیابان ہو گیا۔ ادھر

میرے منہ سے بے اختیار اُٹ نکلا۔ ادھر اس کی نظر میں میری نظروں سے ملیں اور چشم زدوں میں دونوں پر دسے بیچ میں آکر اس طرح مل گئے گویا پہلے ہی سے یونہی ملے ہوئے تھے۔ ڈولی مڑ چکی تھی۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ ڈولی کا تعاقب کر دوں۔ بس اسی دھن میں ڈولی کے کبھی پیچھے پیچھے چلتا تھا اور کبھی آگے جا کر اس امید میں ٹھہرتا تھا کہ پھر پردہ کھلے اور مجھے باز دید کا موقع ملے مگر پردہ تو نہ کھلتا تھا اور نہ کھلا۔ میں آہستہ سے کبھی گنگنا تا تھا اور کبھی زیر لب پردہ کھولو کہتا تھا۔ مگر پردے کو جنبش تک نہ ہوئی۔ کمار مجھے مشتبہ نظروں سے دیکھ رہے تھے مگر میں ساتھ ہی ساتھ چل رہا تھا۔ ڈولی نامعلوم کوچوں اور گلیوں میں سے ہوتی ہوئی یکایک ایسی سڑک پر آ گئی جو میرے مکان کے بالکل قریب تھی۔ میری پریشانی کی کوئی انتہا نہیں رہی جب میں نے دیکھا کہ اس کا رخ میرے ہی مکان کی طرف تھا۔ اب میں نے خیال کیا کہ میرا بھانڈا پھوٹا۔ کماروں نے ڈولی میری سسرال کی ڈیڑھ می میں کھدی اور پکار کر کہا۔ "سواری آئی ہے اتر والو۔"

میں منہ پھیر کر باہر ہی کھڑا ہو گیا۔ سواری اتر گئی اور کمار خالی ڈولی باہر واپس لے آئے۔ مگر مجھے ہمت نہ ہوئی کہ آواز دوں۔ اندر سے ملا کماروں کے پیسے لیکر آئی۔ اس نے مجھے دیکھ کر کہا۔ "دو لھامیاں کب سے کھڑے ہیں؟"

"ابھی آیا ہوں۔" میں نے بدقت جواب دیا۔ "کیا حمان آئے ہیں؟" میں نے انجان بن کر پوچھا۔

وہ جواب بھی نہ دینے پائی تھی کہ اندر سے آواز آئی۔ ”دو لٹا میاں آپ کو اندر بلاتی ہیں۔ وہ پھر واپس آئی۔ یہ سن کر مجھ پر عجیب پھٹا۔ میں نے کہا ہمالوں کو تکلیف ہوگی۔ میں ہمارے جان کے میاں جاتا ہوں۔ یہ کہہ کر میں بڑا ہی تھا کر ان کے چھوٹے بھائی صاحب ”دو لٹا بھائی“، دو لٹا بھائی“ پکارتے آئے اور مجھے اندر لے گئے۔

”یہ دیکھو تمہاری نئی سالی ہیں۔ تمہیں دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا۔“ میری خوشدامن صاحب نے اس طرف اشارہ کر کے کہا۔ اس طرف میں نے دیکھا تو وہی آنکلیں تھیں۔ میرا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ ادھر اس نے آنکلیں پیچی کر کے سلام کیا۔ میری ٹانگیں جواب دے رہی تھیں۔ نہ معلوم میں نے کیا جواب دیا۔ بہر حال میں اپنے کمرے میں لیٹا ہوا اپنے اوپر ملامت کر رہا تھا۔

(نیرنگ خیال)

تکلیف

میرے ایک دوست پر ذیل کا واقعہ گزرا ہے جو انہیں کی زبان میں بیان کیا جاتا ہے۔

تمہید

ہم کہیں وہاں جلتے ہیں تو تکلف شکرے مارے پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھا سکتے اگر زیادہ عرصہ تک ٹھہرنا ہو تو اس کمی کو مختلف ہوٹلوں اور دکانوں میں پورا کرنا پڑتا ہے۔ بیچاری عورتیں چونکہ مجبور محض ہیں۔ اس لئے وہ خوردن برائے زینت کا وظیفہ پرتتی رہتی ہیں اور شکم سیر ہو کر کھانے کی غلطی کبھی نہیں کرتیں۔ میٹھی تکلفات شکرے کہ سوسائٹی سے اٹھتے جا رہے ہیں۔ لیکن ابھی اس ضمن میں ایک بہت بڑا مرحلہ باقی ہے اور وہ نئی دھن کے تکلف سے تعلق رکھتا ہے۔ دراصل اس میں فطری جیاد شرم کا ہاتھ بھی ہے لیکن نقص کا حصہ زیادہ ہے یہ مشاہدہ ہے کہ دھنوں کو بھی بھوک لگتی ہے لیکن وہ سہیہ گرہ کرنے کی ایسی عادی ہیں کہ سہرا ل کے دوران قیام میں چوبیس گھنٹے کا کم و بیش روزہ رکھتی ہیں جو کھانا کھا کر انتظار نہیں کیا جاتا بلکہ صرف دیکھ کر سوکھ کر اور چپکے کر۔

سچ پوچھئے تو یہ ذاتی معاملہ ہے اور اس پر کسی کو قلم اٹھانے کا حق بھی نہیں ہے لیکن چونکہ مجھ کو اپنے دوست سے ہمدردی ہے اس لئے یہ چند جملے تحریر کیے گئے۔ اس کے بعد روئہ اندامت ہے۔

واقعہ

یہ ہے کہ میں اپنی بہن کا چھوٹا بھائی ہوں اس لئے میرے ذمہ یہ ڈیوٹی تھی کہ ان کی سسرال کا جو ایک ہی شہر کے دوسرے محلہ میں واقع تھی روزانہ چکر لگاؤں۔ اور چونکہ میں خالی ہاتھ نہیں جاسکتا تھا اور میری والدہ اپنی محبت کا عملی ثبوت بھی دینا چاہتی تھیں اس لئے مختلف سوغاتوں اور تحفوں کے ساتھ جایا کرتا تھا۔ اس امر کا ذکر بے موقع ہے لیکن کیا کیا جائے کہ اس کا نفس واقعہ سے بڑا گہرا تعلق ہے۔

ایمان کی بات کہنا چاہئے۔ میری ہمیشہ کی ساس ننہیں ان کو بے تکلفی سے کھانا کھلانے کی کوشش کرتی تھیں لیکن کامیاب نہ ہوتی تھیں چونکہ میں ابھی کم عمر تھا اور زمانے مکان میں جاتا بھی تھا اس لئے ان لوگوں نے ایک روز مجھ سے اس امر کا ذکر بھی کیا اور اسی کے ساتھ مجھ سے فرمائش بھی کی کہ میں اپنے مکان سے لائی ہوئی سوغاتوں میں سے کچھ تو انھیں کھلاؤں۔ میں نے ان کو منوں کرنے کے لئے وعدہ کر لیا لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ میں صرف کچھانے کی حد تک کامیاب ہو گیا لیکن کھلانے کی کوشش میں کامیاب

انھوں نے مجھ سے صاف کہہ دیا کہ میں کیسا کروں میرے منہ میں کھانا چلتا ہی نہیں،

جب میں اپنے مکان پر واپس آتا تھا تو والدہ مجھ سے ان کی خیریت مزاج پوچھتی تھیں اور اس کے بعد ان کی غذا اور تندرستی کے اہم مضمون پر ہزار ہا سوالات کر ڈالتی تھیں جب میں ان کے سوالات کا صاف صاف جواب دیتا تھا تو وہ مول اور بخند ہو کر سر جھکا لیتی تھیں۔ آخر ان تھیں۔

لڑکی شادی ہو جانے پر پرلے لھر کی ہو جاتی ہے۔ اس لئے ان کا اب نور تو تھا نہیں کہ جس وقت جی چاہے بلالیں اس لئے انھوں نے مجبور ہو کر مجھ سے مشورہ طلب کیا کہ لڑکی سسرال میں بھی رہے تکلف پر بھی قائم رہے اور تنگم سیر ہو کر کھانا بھی کھائے۔ اسی کوئی ترکیب ہے؟

میں نے جواب دیا کہ بندہ اس غم کو سر کرنے کے لئے حاضر ہے۔ حالانکہ یہ معاملہ خطے سے خالی نہیں ہے۔ بہر حال میں یہ کسی طرح نہیں دیکھ سکتا کہ وہ بچہ کی رہیں اور ہم لوگ تنگم سیر ہو کر کھانا کھائیں۔ یہ سن کر میری والدہ بہت خوش ہوئیں اور دوسرے دن انھوں نے میری ہدایات کے موافق دوپراٹھے اور تنی ہوئی مچھلی کے دو تین ٹکڑے ایک کاغذ میں باندھ کر دیئے جن کو میں نے اپنے رومال میں لپیٹ کر نوٹوں کی گڈی کی طرح اپنی کوٹ کے جیب میں احتیاط سے رکھ لیا اور حسب دستور مختلف سوغاتوں کو ما کے سر پر

رکھو اگر اپنی بہن کے یہاں روانہ ہو گیا۔

ان کے مکان میں پہنچ کر ماما مہ سینی و خان پوش کے ان کی ساس کے قریب پہنچی۔ اور میں منہ پر اٹھوں کے بندل کے اپنی بہن کے کمرے میں دہاں میں دیکھا کہ لڑکیوں اور عورتوں کی ایک لامحدود تعداد ان کے چاروں طرف حلقہ بندی کئے ہوئے ہے۔ میں بھی ایک کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔ مگر مطلع صاف نہ ہوا۔ وہ لوگ اس انتظار میں بیٹھے رہے کہ جب میری ہمشیر مجھ سے بات کرنے کو گھونگھٹ ہٹائیں گی تو ان کو زیارت کرنے کا موقع ملے گا۔ مگر انھوں نے گھونگھٹ کھولا ہی نہیں۔ جب وہ سب بیٹھے بیٹھے یا پوس ہو گئیں تو انھوں نے دوسری چال چلی۔

”بھئی اب چلو“ کہہ کر وہ اس طرح اٹھیں گویا اس کمرے سے باہر جا رہی ہیں مگر چند قدم چل کر میز اکر سی اور دروازے کی کین گا ہوں میں دم سادھ کر بیٹھ گئیں اور اشاروں ہی اشاروں میں مجھ سے اس راز کو محفوظ رکھنے کی درخواست کرنے لگیں۔ میں نے ان کی اس بیگناہ تفریح میں غل ہونا مناسب نہ سمجھا اس لئے اپنی ہمشیر کی اس طرح مزاج پر سی کرنے لگا گویا اب گھونگھٹ کی ضرورت نہیں ہے مگر اس پر بھی وہ ٹس سے مس نہ ہوئیں اور بدستور بیٹھی رہیں۔ آخر وہ لوگ ناکام ہو کر خستہ گھلتے ہوئے باہر چلے گئے۔ میری بہن نے گھونگھٹ الٹ دیا۔

وہ مجھ سے والدہ کی نذرستی کے متعلق کچھ سوالات کر رہی تھیں اور میں ابھی جواب بھی نہ دینے پایا تھا کہ یکایک سامنے کے دروازے میں سے وہی غول پھر نمودار ہوا اور ان کو اس طرح براؤنگنڈہ نقاب بیٹھے دیکھ کر ان میں سے کسی نے خوشی سے تالیاں بجائیں، کسی نے کلکاریاں ماریں اور کسی نے تسنیرانہ انداز میں جھبک کر سلام کیا۔ میں بھی ان کے قہقہوں میں شریک ہو گیا۔ باجی نے ان لوگوں کو دیکھتے ہی گھونگھٹ میں غوطہ مارا۔ اچھی خاصی آنکھ پھولی تھی۔ غرض کہ یہ سلسلہ بہت دیر تک جاری رہا۔ وہ لوگ باہر جاتے تھے اور پھر بمب کے گولوں کی طرح اندر چلے آتے تھے۔ میں اس بلا سے خلاصی پانے کی ترکیب بہت دیر تک سوچتا رہا۔ لیکن اس وقت کوئی بات ذہن میں نہ آئی۔ راہ چارہ یہی تھی کہ اٹھ کر دروازہ بند کر دوں۔ مگر میں اس پر عمل نہیں کر سکتا تھا۔

خدا خدا کر کے ہماری عقدہ کشائی اس طرح ہوئی کہ شادی کا گھر تھا۔ بچوں کی ایک فوج تھی جو مختلف کرتیوں میں مشغول تھی۔ ایک صاحبزادہ صاحب کو نہ معلوم کیا سوچھی کہ وہ چھت پر پہنچ کر سامنے کی پیلی سی ٹینڈر پر تیز روی کی مشق کرنے لگے۔ یکایک سرخچے ہو گیا اور پیرا پر۔ اس جمناسٹک کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دھماکا ہوا اور حضرت پیچھے تشریف لے آئے۔ میں دھس سے بیٹھا اس جمناسٹک کو دیکھ رہا تھا اور یہی پیشین گوئی بھی کر رہا تھا۔ مگر

طریقہ سے اس صورت میں جبکہ اس صورت میں کسی دوسری ذات کا ہاتھ ہو۔

”آخر کچھ کو تو ہوا کیا۔“ میں نے دل سخت کرتے ہوئے تیز آواز میں پوچھا۔

”ہیں!“ کہہ کر وہ میسے۔ لہجہ کی کڑختگی سے دغمت چونک پڑی اور بالوسی سے ایک زخمی ہرنی کی طرح میری طرف دیکھنے لگی۔

میرا دل نرم پڑ گیا اور میں بے اختیار ہو گیا مگر چونکہ اہول ملکیت خویش کے خلاف تھا اس لئے مرحمت خسروانہ کے بجائے تنبیہانہ و تادیبانہ روش جاری رکھنے کا ارادہ کیا لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ آخر شرمناک ہوا پڑا۔

”کسی نے آنکھ دکھائی ہو تو آنکھ نکال لوں“

خاموش

”کسی نے انگلی دکھائی ہو تو انگلی قلم کروں“

”ایسے ہی میرے رفیق ہیں“ اس نے جمل کر کہا اور معاملہ پھیر کر کمرے کے

باہر چلی گئی اور بخوری دیر میں ایک بیش قیمت بنارسی سارھی لئے ہوئے واپس آئی

میں نے اپنے دل میں خیال کیا کہ آج خلاف معمول میری بیگم کا مورچہ میری کمزور

ذات کی طرف کیوں ہے۔ شاید غصے اور تنہا کے زور میں میری لائی ہوئی سوغا

کو میرے ہی سُنہ پر پھینک دیا جائیگا۔ اور اس طرح شادی کے پانچ سال کے عرصہ

میں محبت و الفت کا جس قدر رشتہ مضبوط ہوا ہے آج وہ بڑی بے دردی سے

تور دیا جائیگا۔ مجھ کو اس خیال سے واقعی طیش آیا اور سوچ کر میں بالکل بہک کر

تھا اس لئے میں نے بھی ارادہ کر لیا۔ کہ اگر اس نے اس عزیز ترین سوغات کو ڈالیں
کر دیا تو میں بھی اس کو کھڑے کھڑے آگ لگا دوں گا۔

”بے وجہ روٹھنے۔ رونے اور چیزیں منہ پر مارنے کی وجہ۔“ میں نے غصہ میں
ڈانٹ کر کہا۔ وہ اپنا رونا بند کر کے فرطِ تجر سے میرا منہ دیکھنے لگی۔ اور اس کے بعد
ساڑھی کے پرتوں کو کھول کر کہنے لگی۔۔۔۔۔ ”دیکھ لو“

اب میں آپ سے کس طرح بیان کروں کہ میں نے کیا دیکھا۔ بس اشارۂ آٹنا ہی
کافی ہے کہ سات سو پچاس روپے کی بنا رسی ساڑھی کے سنہرے گل بوٹوں اور نقش و
نگار پر اس صفائی سے پالش کی گئی تھی کہ زری کے تاروں پر کلاتوں کے تاروں کا
دھوکا ہوتا تھا اور یہ کارستانی کس کی تھی۔ آپ کو سن کر تعجب ہو گا کہ یہ نتیجہ تھا
ایک مرغ اور مرغی کے جفاکش اور محنتی جوڑے کی کدو کاوش کا۔

بہر حال میں نے شروع میں کتنی غلط رائے قائم کی تھی۔ یہ معلوم کر کے مجھ کو بچہ
ندامت ہوئی کہ بیگم کا غصہ مجھ پر نہیں تھا بلکہ میری بڑی بھابھی جان کے مرغی کے
اس جوڑے پر تھا جو وہ چند روز قبل اپنے میکہ سے اپنی دادی اماں مرحومہ کی
نشانی کے طور پر لائی تھیں اور جن کو وہ اتنا ہی عزیز رکھتی تھیں جتنا اپنے گود
کے بچے محمود کو۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ محمود کی کلکاریوں سے ان کا دل جتنا باغ
باغ ہوتا ہے اتنا ہی اس مرغی کی کڑک دار بانگ اور مرغی کی تیز حرکت کٹماں
سے بھی دل کو فرحت و انبساط مہل ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں اگر اس قیمتی

ساڑھی کے برباد ہو جائے پر میں اپنے دلی غم و اندوہ کو بیگم کے سامنے ظاہر کر دیتا تو یقیناً دیورانی جھٹھانی میں ضرور دو دو چوچیں ہو جاتیں اور ان دفتوں عورتوں کی پھر پھر اہٹ میں ہم دونوں بھائیوں پر بھی چھینٹیں آتیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ایک گھر کے دو گھر بن جاتے۔۔۔ ان تمام وجوہات کو مد نظر رکھتے ہوئے میں نے اپنے سینہ پر صبر کا پتھر رکھا اور اس کو بھی تلقین صبر کی۔ میں نے وعدہ کیا کہ آئندہ ماہ میں اس سے بہتر ساڑھی لا دوں گا۔ تم اس کا کوئی سوگ نہ منادو اور مصلحت وقت یہی ہے کہ اس حادثہ پر خاموش ہو جاؤ۔ میں نے اس کو یہ بھی تلقین دیا کہ چند دن میں بھابھی جان کے شوق کی دھارا رکے گی تو لن مرے گا تین پانچ ہو جائیگا۔ میری بیگم عقلمند، معاملہ فہم، اور صلح جو تھی اس لئے بھابی جان سے ڈر تک نہیں کیا۔ اور اس طرح یہ معاملہ چند دن کیلئے دب گیا۔

۳۔

ایک روز میں کلچ سے نجائیں ہل کھاتا ہوا آیا اور اپنے کمرے کی طرف چلا۔ دروازے سب بند تھے کیونکہ میری خاتم اس ساڑھی کے حادثہ سے سبق حاصل کر چکی تھی۔ میں نے بیچ کمرے کے دروازے کو دھکا دیا اور اندر داخل ہو گیا۔ کوٹ اتارا۔ کتابیں رکھیں۔ اپنے نوار کے ڈھیلے پلنگ پر بیٹھ کر جوتے کے فیتے کھولے اور اپنے جوتے پہنے۔ جسم کو اس پلنگ پر پھینک کر پانچتلی رکھے ہوئے لحاف کو اٹھا کر اوڑھ لیا۔ تھوڑی دیر میں لیٹا رہا۔ اس کے بعد داہنی کروٹ لی۔ پھر بائیں کروٹ

”تسلیم می صبا! تسلیم، آپ کے اندھے کا شکریہ“ — کٹ کٹ کٹاں،
 کٹ کٹ کٹ کٹاں کے تیز سنگل ایک کہنہ مشق تار بابو کی طرح دینے لگی۔
 ”کیوں غصہ آگیا۔ میں نے انڈا توڑ دیا۔ اس لئے — ہا، مگر میں کیا
 کروں، خود ہی لڑھک کر میرے پیچھے آ رہا۔“

کٹ کٹ کٹ کٹاں، کٹ کٹ کٹ کٹاں، مجھ کو آیا غصہ۔ میں نے گردن
 دلوچ کر اٹھالیا اور ارادہ کیا کہ اس کو گھما کر اس طرح پٹخوں کہ کٹ کٹاں اور انڈے
 دینا سب بھول جائے مگر معا بھابی جان کا خیال آیا۔ اس لئے گھٹ کر رہ گیا۔
 اب سنئے مرغی کی پھر پھڑا ہٹ اور فریاد کی آواز بر خور دار مرغی نے سنی۔ وہ بکارتا
 ڈاڑھی ہلاتا۔ پروں کو پھٹ پھٹاتا آیا اور چاہتا تھا کہ اچاک کر مجھ پر ایک کراری
 ٹھونک جائے۔ مگر میں نے پیشقدمی کر کے ان کی تواضع لات سے کی اور مرغی
 کو ایک ہلکی سی پٹخی دیکر کمر سے باہر کر دیا۔ جب بیگم کو معلوم ہوا تو وہ منہ
 لٹکا کر کہنے لگی کہ ”گھر بدنا پڑ گیا۔ اب ساتھ نہیں رہ سکتے۔“

س

تختوں کے چوکے پر چاندنی چھی ہوئی تھی۔ چاندنی پردہ ستر خوان تھا۔ ستر خوان
 پر کھانے کی قایم، طشت تریاں اور پیالے رکھے ہوئے تھے اور اس کے گرد حلقہ
 باندھے ہوئے۔ ہم۔ بھابی جان، بھائیجان۔ خانم۔ محمود۔ جمیلہ اور نریمان بیٹھے
 ہوئے تھے۔ اتفاق سے بھائی جان چوکی کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے اور بھابی

ان کے مقابل بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ ایک نوالہ خود کھاتی تھیں اور دوسرا نوالہ مرغی اور مرغ کے سلسلے ڈالتی جاتی تھیں جو زمین پر گرتے گرتے غائب ہو جاتا تھا۔ اسی دوران میں محمود صاحب کی آنکھوں میں لکیں مرچیں۔ انھوں نے ہارمونیم بجانا شروع کیا اور بھائی جان اور بھائی جان نے کھانا چھوڑ کر اپنی توجہ کو ان کی طرف منعطف کر دیا۔ یہ موقع بہت غنیمت تھا۔ فوراً مرغی جان اچکیں اور بھائی جان کے سلسلے کی رڈنی پر چرچر سے حملہ کیا۔ اور ایک جھٹکے کے ساتھ اس کو دسترخوان سے ہٹا کر چھپت ہو گئیں۔ اب اس میں اس کا کیا قصور کہ یقیناً روٹیاں بھی اپنی جگہ سے ہٹ کر پیچھے کر گئیں اور اسی جھڑپ میں شو بلے کا بیالہ بھی سر بسجود ہو کر اشک فشانہ گنا۔ سارا دسترخوان ترسہ ہو گیا اور لپٹا پکڑنا کی صدا میں بلند ہونے لگیں۔

”آج ذبح کر ڈالوں گا کجھت کو“ — بھائی جان نے جوش غضب میں لکھا کر کہا۔ اور چشم زدن میں دسترخوان کے اوپر سے کیک کاٹنے کی چھری اٹھا کر پکے ہی تو پڑے۔ مرغی اور مرغ سے ریس کرنا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ انھوں نے بھی ایسے ایسے کاوے دیئے۔ ایسی ایسی جھکائیاں بتائیں کہ بھائی جان کو دوڑتے دوڑتے پسینہ آ گیا۔ ہم سب بیٹھے تماشہ دیکھتے رہے۔ میں اور بیگم گھوڑ دوڑ کے گھوڑوں کی طرح ان پر شرط گمانے لگے۔ وہ کہتی تھی کہ مرغی اول رہی اور میں کہتا تھا کہ بھائی جان بازی جیتنے لگے۔ آخر مرغی نے گھبرا کر روٹی چھوڑ دی اور زمین پر دوڑنے کے بجائے ہوا میں فرارے بھرنے لگی۔ اور مرغ نے اس

کی قدموں اور پروں کے ساتھ تقلید کرنا شروع کی۔ یہاں تک کہ بدحواسی میں ان دونوں نے ہماری ہی طرف رخ کیا اور دسترخوان کو بھلا گئے ہوئے۔ روٹیوں پر کچیرا بھرے بجوں سے چھاپہ مارتے ہوئے۔ پلیٹوں اور قابلوں میں کوڑے کی مٹی کو جھٹکتے ہوئے اور بقیہ شوربے کے پیالوں کو دھکے دیتے ہوئے یہ جا وہ جا۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ بھابی جان جو کھانے کی بربادی کے مقابلے میں اپنی مرغی اور مرغ کی بدحواسی اور پریشانی پر بیٹھی ہوئی بیچ و تاب کھا رہی تھیں بول اٹھیں۔۔۔ کہیں پکڑ ہی نہ لیا ہو۔“

بھابی جان جو اس دوڑ میں کچھ مست ہو چکے تھے پھر پھر گئے اور انہوں نے زیادہ مستعدی سے اتنا قب کرنا شروع کیا۔ مگر مرغیوں کا شور اب اس بھاگ دوڑ میں ہارنے کے قریب تھا۔ سامنے کے دروازے میں سے کمرے میں داخل ہو گیا۔ بھابی جان بھی اسی طرف پلے۔ وہاں جا کر مرغی تو تخت کے نیچے چھپ کر غائب ہو گئی اور مرغ سے پروں کو پھٹ پھٹا پھٹا چھٹا کر اچھل کود کا مظاہرہ کرنا شروع کر دیا۔ بھابی جان قریب تھا کہ اس کو پکڑ لیتے مگر اتفاق سے مرغ نے ایسی چھلانگ اڑی کہ کانس پر رکھے ہوئے تمام چینی کے برتنوں میں تلاطم پیدا ہو گیا اور ان میں سے بہت سے تھن جھناتے ہوئے نیچے آ کر شہب ہو گئے اب موقع تھا بھابی جان کا۔۔۔۔۔ برتنوں کے اور وہ بھی تھن کے برتنوں کی جھنکار نے ان کو لرزہ بر اندام کر دیا اور وہ گرجتی ہوئی بھابی جان کے قریب

ہو بیچ گئیں۔ دوچار پھیکوں ہی میں بھائی جان کمزور پڑ گئے اور یہ ڈراما اس طرح ختم ہوا کہ برتن ٹوٹے الگ۔ فاقہ ہوا الگ۔ لڑائی ہوئی الگ۔ مگر سادکی چڑ مرغیاں اسی طرح صحیح و سلامت رہیں۔ بیگم کو اس کا بے انتہا افسوس ہوا کہ اس کی امید پر پانی پھر گیا۔ اس کو آج یقین ہو گیا تھا کہ یہ گھر اس اگھوری مخلوق کے وجود سے بالکل پاک ہو جائیگا۔

۴

آج ہماری پرانی ماما گلچمن کو بھابی جان نے نوکری سے برطرف کر دیا کیونکہ وہ جانوروں پر ظلم کرتی تھی۔ انہوں نے احسان کیا کہ مقدمہ نہیں چلایا ورنہ اس کو سزا ہوتی۔ اول تو یہ کہ وہ مرغیوں کو حتی الامکان ٹاپے میں بند رکھتی تھی اور اس طرح ان کو تازہ ہوا سے محروم رکھتی تھی۔ جب بھابی جان نے ان جانداروں پر رحم کھا کر ان کو تھوڑی دیر کے لئے آزادی دے دی تو اتفاق سے وہ باور چیلنے میں ہو بیچ گئے۔ جہاں وہ بیٹھی ہوئی روٹی پکا رہی تھی۔ مرغی نے محض مذاق سے سینی میں سے اگر ایک پیڑا اٹھا لیا تو اس کو کون چھین کر وڑکی چوتھائی کا نقشہ ہو گیا۔ مگر گلچمن نے اس بیڑیاں پر اتنی زیادتی کی کہ معان پر پھکنی چارچ بول دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بیچاری دنگڑی ہو گئی۔ جی ہاں اگر مر جاتی تو یہ خون کس کی گردن پر ہوتا۔ آج کو اس نے مرغی پر ہاتھ اٹھایا۔ کل کو وہ اتنی جرات کر گئی کہ محمود میاں جب کوئی شہ رات کر نیگے تو ان کے ساتھ بھی وہ ایسا ہی سلوک

کرے گی۔ واہ جاندار سب برابر ہیں۔ یہ تو مرغی ہے۔ ہندوستان میں تو ایک گائے کی دُم کے ٹوٹ جانے پر ہزاروں انسانوں کے خون بہہ جاتے ہیں۔



بیگم اسکول کی پڑھی ہوئی خاتون ہے۔ وہ انگریزی فیشن کی بڑی دلدادہ ہے کیونکہ وہ ہر وقت گھر کی صفائی میں لگی رہتی ہے۔ ابو الحسن تانا شاہ کی روح نے عورت کا جنم لیا ہے۔ کفر کے کلمے تو دیکھئے کہتی ہے کہ صفائی خدا تک پہنچا دیتی ہے گویا مذہب کوئی چیز ہی نہ ہوا۔ یہ تعلیم دلانے کا چہل ہے اور کیا کہا جائے۔

مرغیاں کوڑا بکھیرتی ہیں اور صحن میں گڑھے کر کے ان کی خاک میں لوٹی ہیں یہ الزام ہے جناب۔ مگر اتنا خیال نہیں کہ یہ رزق کے دانے جو بھولے چوکے زمین پر گر جاتے ہیں اور چلنے والوں کے پیروں کے نیچے آتے ہیں ان کا عذاب کون بھگتیگا؟ بیچاری مرغیاں ان کا کھوج لگا لگا کر چن لیتی ہیں۔ تو یہ بُرائی ہو گئی۔ ہاں یہ مانتی ہوں کہ کبھی کبھی غلیظ کھا جاتی ہیں۔ مگر اس سے کیا قباحت ہو گئی۔ پیٹ میں کس کے پاکیزگی ہے؟ اس پر طعن یہ مارتی ہیں کہ جب یہ مرغیاں گھر میں موجود ہیں تو ہنتر کی کیا ضرورت ہے؟

کل بیٹھے بیٹھے تنک مزاجی سوار ہوئی تو پانی پینے کے گھڑوں کو ایک ایک کر کے توڑ ڈالا۔ جب پوچھا تو جواب ملا کہ۔۔۔ مرغیوں نے چونچیں ڈالی تھیں۔

ارے صاحب! مرغیاں اپنی چوہچوہ اس طرح رگڑ رگڑ کر صاف کرتی ہیں کہ ہم اپنا منہ بھی صاف نہیں کر سکتے۔ مذہب سے ثابت ہے کہ حلال جانوروں کے منہ اور چوہچوہیں پاک ہوتی ہیں۔ خیر اگر ناپاک ہی سہی تو اتنا نہیں دیکھ سکتے کہ گھڑے ڈھکے رہیں مگر اتنی محنت کس سے ہو؟

روز روز کا پیٹنا ہے کہ ساڑھی خراب کر دی۔ بستر کی چادر خراب ہو گئی۔ مگر یہ بھی تو کہئے کہ وہ تھانور ہیں۔ ان کو عقل و تمیز کہاں کہ یہ بستر ہے اور یہ زمین۔ آخر کمرے کا دروازہ بند کیوں نہیں رکھا جاتا۔ چیزیں کھلی کبوں رکھی رہتی ہیں۔ اچھا یہ بھی سہی۔ تو پھر کیا کیا جائے۔ میرا محمودی کبھی کبھی بستر اور تو شک خراب کر دیا کرتا ہے تو کیا میں اس کو گھر سے کال دونگی؟ اچھی کسی۔

ایک الزام ہو تو کہوں۔ کتنی ہیں کہ چلے میں مرغی کے پرنکلے۔ اچھلکے۔ مگر میں اس بات کا ثبوت دے سکتی ہوں کہ چائے تو چائے کھانے اور سالن میں سر کے بال نکلا کرتے ہیں۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ سر کی چوٹی کاٹ ڈالی جائے واہ اچھی منطق ہے۔

اور سنئے مرغارات کو بھی سونے نہیں دیتا۔ اشدری نزاکت، یہ سڑک پر سپاہی بولتے ہیں جلگتے رہو! — ذرا ان سے کہدینا کہ بھئی ہائیں شور کیوں مچاتے ہو۔ ارے خاموش رہو۔ ہماری نازک دماغ یکم صاحبہ آرام فرما رہی ہیں اگر ایسا ہی ہے تو وہ میرے محمود کا رات کا رونا بند کرا بیٹگی — بر خلاف

اس کے ان کو مرغ کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ سویرے سویرے موذن کی اذان سے پہلے اذان دیتا ہے اور خداوند کریم کی حمد و ثناء کر کے گھر میں برکت لاتا ہے۔ خدا توفیق دے تو اس جانور سے سبق لیکر اذان و نماز، تسبیح و درود سیکھیں مگر اتنا ہوش کسے؟

میم بنی ہیں بیجاری، مگر اتنا نہیں معلوم کہ میں ہی مرغیوں کو پالتی ہیں او کتوں کو پیار کرتی ہیں۔ غرض کہ ان کو ضد ہے مجھ سے اور میکہ کی سوغات سے۔ بھلا دادی اماں کی نشانی میرے پاس کیسے رہے۔ مگر منہ دھوئیں ان کی مجال تو ہے نہیں کہ میری مرغیوں کی طرف تیرھی نگاہ سے دیکھیں۔ اس روز چٹری اٹھائی تھی تو میں نے حشر برپا کر دیا تھا۔ کس میں ہمت ہے۔ اس کو دیکھوں کون ہے ذبح کرنے والا؟ دسکی دیتی ہیں گھر چھوڑنے کی۔ چھوڑ دیں مجھ پر احسان کیا؟ یہ بھی بہانہ ہے۔ دل تو خود الگ رہنے کو چاہتا ہے۔ ابھی پارساں کی بات ہے کہ بی صاحب نے طوطا پالا تھا۔ تو کیا میں نے بھی گھر چھوڑنے کی دھمکی دی تھی۔

حد کر دی ہے۔ کہتی ہیں کہ مرغیوں نے میرے پیروں کے پتے کھٹکائے ان کا ستیاناس کر دیا۔ میں کہتی ہوں کہ اول تو پیروں سے چھڑ پیدا ہوتے ہیں جن سے میریا ہوتا ہے۔ دوسرے اگر اس کا خیال نہ بھی کیا جائے تو ان کے گلوں کو کسی اونچی جگہ پر رکھا جاسکتا ہے یا جالی لگائی جاسکتی ہے تیسرے

مرغیاں بچے کے پتے کھنکھاتی ہیں۔ اس غل سے تو پڑ پھل پھلا کر بڑھتے ہیں۔ آخر مالی بھی تو بچے ہی کے پتے کاٹ کر پھینکتے ہیں۔ انا علم نہیں تو اسکول کی پڑھائی کس کام کی ہے۔

الزام گنا دیئے۔ یہ نہیں جانتیں کہ جب سے گھر میں مرغیاں آئی ہیں رونق ہو گئی ہے۔ چوہیوں سے بھی بچھا چھوٹا ہے۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہلاک کر ڈالتی ہیں پتنگوں اور بڈوں کو بھی کھا جاتی ہیں، انڈے دیتی ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ میرا محمود ان کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔

یہ کتب الباسب ہے، ہماری بھابی جان کی جوابی تقریر کا جو انھوں نے خاتم کی تحریک کے مرغیوں کا وجود صفائی پسند انسانوں کے لئے عذاب ہے۔ اس کی مخالفت میں وقت کے وقت سُنائی تھی۔ اور اس کی تجویز کے جھپٹے بکھر کر رکھ دیئے تھے۔ اگر ہوتی یہ تقریر یا ریمسٹ میں تو کج لیڈر۔ پائیز اور اس کے صفحات بھرے ہوئے ہوتے۔ بھابی جان زندہ باد!

۶

بیگم ذبی اور کمرہ ہو رہی ہے۔ مرغیوں کوئی اور فریب ہو رہی ہیں۔ اور لیجئے۔ وہ آئندہ کے خطرے سے کاہنی جا رہی ہے۔ بھابی جان نے ایک الٹی ٹیم اور دیا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ یہ مرغی گھاتا رانڈے دیتی ہے۔ کرکٹ بھی نہیں ہوتی۔ اس لئے اس کے انڈے بھائے جائینگے۔ اللہ بچائے۔ اب تو اس گھر

کا خدای ہی حافظ ہے۔ ایک ہی جوڑے نے میری بیگم کو دُہلا اور کمزور کر دیا ہے اب یہ مرغیوں کی فوج ضرور اس کو مرضِ دق میں مبتلا کر دیگی۔ وہ یوں بھی ڈرتی ہے کہ مرغی کے بچوں میں رُہیں ہوتی ہیں جو سارے بدن کو لوبچ ڈالتی ہیں۔ میری جان سخت مشکل میں ہے۔ یہ گھرا بیٹا ہے کہ یہاں کوئی بلی بھی نہیں آتی، ورنہ ایک ہی رات میں مشکل آسان ہو جاتی۔۔۔ سحر و شام التجاہے کہ لیلو کی نسل میں افزائش ہو۔

۷

گھر میں کچھ نئی عورتیں آیا کرتی ہیں۔ خو پچنے والیاں اور پان تمباکو کھانے والیاں۔ اول الذکر بھابی جان کو بہت سستا سودا دیتی ہیں اور آخر الذکر شہر کے اخبارات کا اقتباس سناتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ان پر بہت جلد اپنا سکہ جما لیا ہے۔ دراصل یہ ایک قسم کی اسیکم ہے جس کو بار آور کرنے کیلئے مجھ کو اپنی جیب پر بارڈالنا پڑتا ہے۔ یہ عورتیں میری بیگم کی سخت مزاحی کی تسکاتیں بھی کرتی رہتی ہیں اس لئے بھابی جان ان کو اور بھی عزیز رکھتی ہیں۔

آج نتو کی اماں دھنو مہری، اور خیراتی کی بہو نے یکن زبان ہو کر مرغی اور مرغ کی تعریف میں قصیدے پڑھے اور بھابی جان کو یہ یقین دلانے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی کہ ان جانوروں کے ہونٹ کا دوسرا جوڑ کسی والی ملک کے یہاں ہوتا تو دور نہ کہیں اور نہ ہوگا،

ایک نے کہا ————— ”دیکھنا کیسا بانکا مرغ ہے۔ سچ کوئی فوج کا کرنل معلوم ہوتا ہے“

دوسری نے کہا ————— ”اس کلغی اور تاج سے شہزادہ معلوم ہوتا ہے۔“
 تیسری نے کہا ————— ”مرغی کیسا ہے، بس چوتھی کی دُکھن ہے۔“
 بھابی جان نے کہا ————— ”قدرت کی کارِ گیری ہے کہ ان سُنہری روپلی پروں کے سامنے زیور بھی ہتھی ہیں۔“

جواب ملا کہ ————— ”مرغی کو دیکھ کر مجھے اپنی صورت سے شرم آ رہی ہے۔“
 ”تائید ہوئی کہ ————— ”کاش اللہ بیاں ہیں مرغی ہی بنتے۔“
 امانہ ہوا کہ ————— ”ایسے کہاں نصیب!“
 سب نے قہقہہ لگایا۔

بھابی جان نے فخر یہ کہا کہ ”یہ میری دادی اماں کی شوق کی چیزیں تھیں۔ او۔
 ان کا شوق ایسا ہی ہوتا تھا کہ دور دور اس کا شہرہ ہو جاتا تھا۔ بد قسمتی تو یہی ہے
 (آہ بھر کر) کہ ان کو ان مرغیوں کی بہار دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔“
 بکربان ہو کر دعا دی گئی کہ ”خیر اللہ آپ کو سلامت رکھے اور ان کی بہار
 دیکھنا نصیب کرے۔“

اسی اٹار میں مرغ نے منہ کھول کر اذان دی۔ جس کو سنتے ہی نتو کی اماں
 نے کان کھڑے کئے۔ دھن دھن مہری نے بہنوں چڑھائیں اور خیرانی کی بونے چیرے

پرخوف کے آثار لا کر کپکپی لی اور کجاہ رگی کانوں میں انگلیاں دیکر اٹھنے کا ارادہ کیا جس پر فتو کی اماں نے چٹکی لے کر بٹھالیا۔ اس گونگے تماشے کا مطلب بھابی جان کی سمجھ میں خاک نہ آیا۔ انھوں نے متغیر ہو کر وجہ پوچھی تو ان عورتوں نے ٹالنا چاہا مگر اتفاق ایسا کہ مرغ نے پھر اذان دی جس کو سنتے ہی وہ دونوں عورتیں بھی اسی ایکٹ کو دہرانے لگیں جو خیراتی کی بہونے اول بار کیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بھابی جان اس کی علت غائی کے معلوم کرنے پر بضد ہوئیں۔ اور وہ عورتیں اس کو پوشیدہ رکھنے پر مُصر ہوئیں۔

”کچھ بھی نہیں!“

”مذاق تھا۔“

”نہیں مذاق نہیں تھا۔ تمہیں بتانا پڑ گیا۔“

”آپ سے ڈر لگتا ہے۔ ہماری اوقات ہی کیا کہ آپ کے سامنے منہ کھولیں۔“

”میں اجازت دیتی ہوں۔ کہو۔“

”نہیں بیگم، نہ کہیں گے۔“

”تمہیں ہمارے سر کی قسم۔“

آخر ش خیراتی کی بہونے ڈرتے ڈرتے منہ کھولا ہی تھا کہ فتو کی اماں نے جھڑک کر روک دیا۔ مگر دھنواہری نے اجازت دیدی۔

کہنے لگی کہ — ”آپ کے مرغے کی بانگ بہت منحوس ہے۔“

بھابی جان نے تیوریوں پر بل لاکر لوچھا — ”کیسے؟“

”چوہٹ گاؤں بولتا ہے۔“

”تو اس سے کیا ہوا؟“

”بات یوں ہے کہ مرغ تین طرح کی آواز نکالتے ہیں۔“

دانا گاؤں

سترہ گاؤں

چوہٹ گاؤں

آپ کا مرغ چوہٹ گاؤں بولتا ہے اور کبھی کبھی ”تجھکو کھاؤں“ بھی کہتا ہے۔ آپ کو تو حلال کر کے اس کی بوٹیاں اپنے اوپر سے صدقے کر کے چیل کوئوں کو کھلا دینا چاہئے۔

بھابی جان نے غصہ میں کہا۔ ”ہٹ جھوٹی۔“

سب نے بیک آواز کہا کہ۔ ”خدا غارت کرے جھوٹ بولنے والیوں کو۔“

ایک نے کہا۔ ”کوئی فائدہ ہے ہمارا؟“

دوسری نے کہا۔ ”کوئی دشمنی ہے آپ سے۔“

تیسری نے کہا۔ ”ہم تو ابھی اس کی تعریف ہی کر رہے تھے۔“

اس اثناء میں مرغ نے پھر اذان دی۔ جس پر تینوں نے کانپتے ہوئے کہا

کہ دیکھئے ”تجھکو کھاؤں“ صاف بول رہا ہے۔“

بھابی جان نے کان لگا کر سنا تو کہنے لگیں کہ ہاں کچھ شک تو مجھے بھی آتا ہے۔“

جواب ملا کہ — ”شک کیسا دہ تو برا بھی سُن لیگا“
 دھنواہری نے کہا — ”جان ہے تو جہاں ہے، اس کو ابھی حلال کیجئے“
 اصرار ہوا کہ — ”دیر نہ کیجئے“

تجویز ہوئی کہ — ”مرعی بھی اسی نسل کی ہے اس کو بھی لیجئے“
 شہادت میں قصہ بیان ہوا کہ ایک ایسا ہی مُرغا تھا ہمارے محلہ میں —
 اُس کے آنے کے چھ مہینہ بعد سارا گھر صاف ہو گیا — پہلے میاں مرے پھر
 بیوی کی جان گئی۔“

بھابی جان کا اپنے لگیں — میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جس وقت میں کان
 سے نکلا ہوں تو خیراتی کی بہو کیک کاٹنے کی چھری پتھر پر تیز کر رہی تھی۔ اور دھنوا
 ہری اُن دونوں کو گھیر کر ٹاپے میں بند کر کے کی کوشش کر رہی تھی۔ بیگم کے
 متعلق اگر آپ استفسار کریں تو میں یہ بتانے کے لئے تیار ہوں کہ وہ کمرے میں
 کھڑی ہوئی اپنے منہ میں رومال ٹھونس رہی تھی۔ تاکہ سنہی کی آواز نہ نکلے۔

(سالنامہ نیزنگ خیال)

نانا جان

ہمارے نانا بابا خدا بخشے بڑے اللہ والے آدمی تھے۔ ان کی عمر پچھلی برسات میں چھیاسٹھ برس کی پوری ہو گئی تھی۔ ان کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ جن کو وہ انڈے کا تیل لگا کر خوب موڑ موڑ کر تاؤ دیا کرتے تھے۔ ڈاڑھی گھنی تھی اور بیچ میں سے دونوں کٹوں کے اوپر چڑھالی تھی۔ قد لمبا اور ہاتھ پیر خوب مضبوط تھے جس وقت وہ روئی کا لمبا دگلا پن کر اپنی دائرھی کو کس کر سر پر لپیٹ کر باندھ لیتے تھے تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چھتری چلا آ رہا ہے۔

ہم لوگ ان سے بہت ڈرتے تھے۔ ہم کو جب وہ شرارت کرتے دیکھ لیتے تھے تو غصے سے ان کی آنکھیں سُرخ ہو جاتی تھیں اور دُور سے ایک لمبی ڈانٹ بناتے تھے اور ہماری طرف اپنا بھاری ڈنڈا لیکر دوڑتے تھے تو ہم سوائے اس کے کہ اپنے پاگلے کو تر کر دیں اور کچھ بن ہی نہ پڑتا تھا۔

وہ بڑے بہادر تھے۔ کہتے تھے کہ میں نے نوٹ کے بل پر سود و سودیوں سے ایکے مقابلہ کیا ہے۔ میری لکڑی بالکل اس طرح گھومتی تھی جس طرح انڈین گگلس اپنی تلوار کو تنکے کی طرح چلاتا ہے۔ میری لکڑی سے لوگ پروانوں کی طرح پٹ پٹ

گرتے تھے۔ انڈین ڈگلس کی طرح نہیں کہ مارتا سب کو ہے لیکن زخمی کسی کو بھی نہیں کرتا۔
 حقہ بہت پیتے تھے۔ کش کھینچتے جلتے تھے اور اماں جان کو اپنی بہادری کی
 داستان سناتے جاتے تھے۔ ہم لوگ بھی چپکے بیٹھے سنا کرتے تھے۔ رات کا وقت
 ہوتا تھا۔ اتفاقاً اگر ہم کو نیند آگئی تو فوراً ہمارے کان کی ٹوک کو گھما کر خوب سی چابی
 بھر دیتے تھے اس کا نتیجہ یہی ہوتا تھا کہ ہم چھوٹے بچن کی طرح اپنی سیٹی کا سلسلہ
 شروع کر دیتے تھے اور ہماری یہ آواز اس وقت تک کم نہ ہوتی تھی جب تک کہ ہم
 کان کی ٹوک ختم نہ ہولیتی تھی۔

”بد نصیب کمبخت!“ ہم رورہے ہیں اور وہ کچر پلا رہے تھے۔ ”ارے میں تو
 تیری ہی لئے یہ تھکے کتا ہوں کہ تو بہادری پکڑ۔ تو جوتا بزدل ہے کہ تجھے اپنا
 نواسہ کہتے مجھے شرم سی لگتی ہے۔“ اماں جان ہمیں اٹھا کر گلے سے لگا لیتی تھیں او
 پیار سے ہمارے سر کو تھپ تھپانے لگتی تھیں تو ان سے کہتے تھے کہ ”بڑی ماما ہے
 جاؤ اسے میرے سانسے سے لیجاؤ۔ کان پھٹے جلتے ہیں۔ بھئی اب میں سوؤں گا“
 دوسرے روز پھر جب حقہ پینے بیٹھتے تھے تو تاکیداً اماں جان کو بلا کر بٹھاتے تھے
 اور ہم لوگوں کو اپنے کارنامے سناتے تھے۔ اسی دوران میں اگر ہمارے باوا جان
 آگئے بس وہ فوراً داستان بند کر کے حقہ پھونکنے لگتے تھے اور ہم سے کہتے تھے
 کہ جاؤ سوؤ، زیادہ رات تک مت جاگا کرو۔

ہماری چھوٹی باجی ملیر دُن سے بہت گستاخ تھیں وہ اسی وقت ضد کے

کہنے لگتی تھیں کہ ”اللہ! یہ تو بادل بجے کہ آپ نے اس اردہے کا منہ کس طرح چیرا۔
تو فوراً رخ بدل کے گلچمن کو آواز دیتے تھے۔ حقے کو گایاں دیتے تھے اور آگ
کو کوسنے لگتے تھے کہ بجت چلم کو سلگنے ہی نہیں دیتی۔ بھائی ابا سمجھ جاتے تھے اور
مسکراتے ہوئے وہاں سے پلٹ آتے تھے۔

ایک روز ہم سے پانی کا لوٹا منگایا۔ ہم سات برس کے تو تھے۔ ان کا جنگی لٹا ہوا
لوٹوں کا قبلا گاہ تھا کس طرح اٹھا کر لاتے۔ ہم نے اٹھا تو لیا لیکن فوراً ہاتھ سے
چھوڑ بھی دیا۔ پانی ادھر گر ا۔ غصہ اُدھر انھیں آیا اور کانپے ہم۔

”جمیلہ!“ ہماری ماں کی طرف مڑ کر بولے۔ ”ارے یہ کیسا لڑکا ہے؟ اس کا
غلط کر اؤ۔ جب یہ لوٹا نک نہیں اٹھا سکتا تو اپنا گھر بار کس طرح اٹھائیگا؟“
”ارے دیکھ!“ ہماری طرف مڑ کر اپنی آستین کہنیوں تک چڑھا کر گرجتے تھے
”خبردار جو تو نے مجھے نانا آبا کہہ کر پکارا۔ میں نہ تمھاری ماں کا باپ اور نہ تمھارا
نانا۔ نام بدنام کر گیا۔ ارے وہی احمد علی (خود کا نام) جن کا نام بہادری میں دینا
جانتی ہے۔ ان کا نواسہ اتنا کمزور۔ ہائے افسوس! جب میں اتنا بڑا تھا۔
تو رینڈیڈنسی کی توپ کا گولہ تنکے کی طرح اٹھا لیا کرتا تھا۔ جوانی میں تو میں نے
انج سے بھری ہوئی گاڑی کو ایک ہاتھ سے اٹھا کر کچڑ سے باہر نکال کر
مٹرک پر کر دیا تھا۔“

ماموں جان کی نئی شادی ہوئی تھی۔ دُھن مانی گھونگھٹ کاڑھے سر جھکا
 صحن میں چوکی پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ بڑی چھوٹی اور مبھلی باجی۔ نیم والی بجیا۔
 ننھی صاحبزادی۔ بیگم آپا اور بہوان کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔ اماں جان
 چوکے پر تھیں۔ بڑی آپا وظیفہ پڑھ رہی تھیں اور نانا جان کچھ فاصلے سے مسہری
 پر بیٹھے۔ پیریتچے لٹکائے حقہ پی رہے تھے۔ مردوں میں اور کوئی نہ تھا۔ سب
 باہر مکان میں بیٹھے ہوئے تھے۔

گلچمن پانی بھرنے صحن کے نل کے پاس آئی اور یکا یک گھڑا بھینک کر
 لگی چلانے۔ ”ہے ہے سرکار سانپ!“ اس الارم کی گھنٹی کی آواز نانا جان
 کے کان میں جو گئی تو بس اچھل پڑے۔ گھبراہٹ میں حقہ اوندھ گیا۔ چلم لوٹ گئی
 حواس جاتے رہے۔

”ارے کہاں ہے؟“ انھوں نے ایسی آواز نکال کر کہا جیسے خواب میں
 ڈر گئے ہوں۔

”وہ آپ کے سر پرانے مسہری کے پائے کے پاس۔“ اس نئے اشارہ کر کے کہا۔
 اتنا سننا تھا کہ نانا جان ہی ای ای کر کے جوتہ پہنے ہوئے مسہری پر چڑھ
 گئے حالانکہ تلوؤں کی کچڑ سے سفید چادر لت پت ہو گئی اور لگے اچکنے بطف
 تو یہ تھا کہ تمام عورتیں، لڑکیاں اور بچے پلنگوں اور تختوں پر کھڑے تھے ہن

سانپ، ہے ہے سانپ“ کا ماتم کر رہے ہیں اور زانا جان بھی اسی میں اپنا سُر
لا کر ہے ہے سانپ، ہے ہے سانپ“ الپ رہے ہیں۔۔۔ آخر ہماری
بڑی آیا (نانی اماں) کو ہوش آیا اور حواس ٹھکانے ہوئے تو انھوں نے چلا کر
لہا۔۔۔ ارے مردوں کو بلاؤ سانپ ہے۔ جس پر ہمارے زانا جان نے بھی اسی
طرح ہاں میں ہاں ملائی۔۔۔ ارے مردوں کو بلاؤ۔۔۔ گویا وہ خود مرد
نہ تھے۔ ان کے اس طرز عمل پر اب نانی اماں کو غصہ آیا اور وہ ان کی طرف
آنکھیں نکال کر بولیں۔۔۔ ارے آخر۔۔۔

وہ یہیں تک کہنے پائی بھیتیں کہ باہر سے مرد آگئے اور اپنی اپنی لکڑیاں لے
کر بڑھے ہی تھے کہ زانا جان نے گھبرا کر کہا۔ کہ ”دیکھو! مجھے میرے کمرے میں
پیونچا دو میں جا کر اپنی لکڑی لیتا آؤں۔ اتنی دیر سے لکڑی مانگ رہا تھا کسی نے
دی ہی نہیں ورنہ اب تک مار کر ٹکڑے اڑا دیئے ہوتے۔۔۔“
کسی نے ان کی طرف خیال نہ کیا۔ خالو آبانے لکڑی اٹھا کر سانپ پر ماری
ہی تھی کہ ماموں جان نے لپک کر ہاتھ میں اٹھالیا اور گھما کر عورتوں کی طرف
پھینک ہی تو دیا۔۔۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چیخیں مار مار کر ایک پر
ایک گرتا پڑتا بدحواس ہو کر بھاگا۔

ایسی اثناء میں میری نظر پڑ گئی۔ میں نے بیدھڑک جا کر ہاتھ سے اٹھالیا
کیونکہ وہ سانپ نہیں تھا بلکہ چمڑے کا ایک گاؤ دم فیتہ تھا جو میں کھینٹے کھینٹے

۲۴۸

نانا جان کے سر ہاتے بھول کر چلا آیا تھا۔

(سیلی ۳)

کنوارے کا مکان

میرے مکان میں اندر باہر کا کوئی سوال ہی نہیں ہے کیونکہ جب میں مکان کے باہر ہوتا ہوں تو اس کا دروازہ بند رہتا ہے اور جب اندر ہوتا ہوں تو کھلا رہتا ہے اس کے داخلہ پر ”بغیر اجازت اندر آنے کی اجازت نہیں“ کی تختی بھی نہیں ہے کیونکہ یہ ریل کے ڈبوں میں ”تھو کو مت“ کی تختی کی طرح بالکل ہی بیکار ثابت ہوتی ہیں ملاقات کے اوقات بھی مقرر نہیں کر سکتا کیونکہ میرے دوست ریل گاڑیاں نہیں ہیں کہ انھیں تضادم کا اندیشہ ہو۔ وہ تو اتنا جانتے ہیں کہ دنیا میں میرے لئے وہی چیزیں تخلیق کی گئی ہیں ایک دفتر اور دوسرے وہ خود اس لئے اس اصول پر کہ قدرت میں خلا محال ہے وہ مجھ کو کبھی تنہا نہیں چھوڑتے۔ بعض اوقات میں اس قدر پریشان ہو جاتا ہوں کہ حضرت آدم کے ————— ان لمحوں پر رشک کرنے لگتا ہوں جبکہ وہ پہاڑ کی ایک چوٹی پر اکیلے بیٹھے ہوئے حوا کے فراق میں آنسو بہا رہے تھے چنانچہ اگر دنیا دوبارہ بسائی جائے اور مجھ کو باوا آدم کا روپ دیا جائے تو میں ایسی تنہائی پسند کر دوں گا کہ جس میں حوا کا فراق بھی نخل نہ ہو۔

”مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ کے عنوان سے سجاد حیدر یلدرم نے دوستوں کی صرف اتنی شکایت کی ہے کہ وہ انہیں مضمون نہیں لکھنے دیتے لیکن مجھے خوف ہے کہ وہ مجھے زندہ نہیں رہنے دیں گے۔ اس سے میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ خدا نخواستہ ان کا تعلق کسی دہشت پرست جماعت سے ہے۔ بلکہ دنیا کے تمام دوستوں کی طرح وہ بھی نیک نیت واقع ہوئے ہیں اور دراصل میں ان کی نیکی ہی کا شاکی ہوں۔“

کبھی کبھی میں مہنس کر اُن سے شکایت کرتا ہوں تو وہ مقابلہ زوردار لڑتے لگا کر میری بات کو اڑا دیتے ہیں اور آخر میں وعدہ کرتے ہیں کہ جب میری شادی ہو جائیگی تو وہ مجھ کو تکلیف نہیں دیں گے۔ لیکن یہ تو الٹی منطق ہے۔ وہی تو زمانہ ہے جبکہ دوستوں کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے اور جوں جوں انسان عمر ہوتا جاتا ہے یہ ضرورت بڑھتی ہی جاتی ہے کیونکہ اس وقت بیوی کی زیادتیوں سے دوست محفوظ رکھتے ہیں اور دوستوں کی زیادتیوں سے بیوی۔ دراصل انسانی مسرت کا راز اسی اہول میں مضمر ہے کہ انسان خود کو کسی کے ہاتھ بالکل ہی فروخت نہ کر دے بلکہ بیانا اور بیعنامہ کے بین بین رہے۔ کیا یہ سب کا تجربہ نہیں ہے کہ کرسی کی پشت پر بھی زیادہ تکیہ کرنے سے سر پیچ ہو جاتا ہے اور ٹانگیں اوپر۔

میرا مکان بیک وقت کتب خانہ۔ چوپال۔ مسافر خانہ اور ہسپتال ہے۔ چند دوست جو کتابوں اور رسالوں کے بہت شوقین ہیں میرے یہاں صرف مطالعہ

کی غرض سے آتے ہیں اور جب تک ان کا جی چاہتا ہے اس طرح بیٹھے رہتے ہیں جیسے اسکندریہ کے عجائب خانے میں مرمریں مجسمتے۔ ان سے مجھے شکایت تو نہ ہونی چاہئے لیکن ان کے چلے جانے کا بعد جب میں اپنی الماریوں کی منتشر کتابوں کو دیکھتا ہوں تو مرثیوں کی ہزیمت خوردہ فوجی صفوں کا منظر میری آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی تعداد میں بھی کمی واقع ہو رہی ہے۔ دوستوں کی نہیں بلکہ کتابوں کی، کیونکہ ان کو شروع میرے یہاں کیا جاتا ہے اور ختم اپنے یہاں۔ حالانکہ وہ انتہائی راستبازی سے نیت کرتے ہیں کہ ان کو ضرور واپس کر دینگے۔

میرے دوستوں کے ہمان واقعی اس الزام سے بری نہیں کئے جاسکتے کہ وہ ہمیشہ اچانک حملہ آور ہوتے ہیں چنانچہ ایسی مجبوری کی حالت میں جبکہ ان کے ٹھیرانے کا کوئی فوری بندوبست نہیں کیا جاسکتا وہ میرے مکان میں قیام کر لیتے ہیں تو اس میں کوئی حرج نہ ہونا چاہئے اور اگر اتفاقیہ طور سے ان میں سے کوئی صاحب بہ سبب خرابی آب و ہوا بیمار ہو جائیں تو غسل صحت سے قبل کس طرح اس قابل ہو سکتے ہیں کہ سفر کی صعوبتوں کو برداشت کریں اور یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ مسافر اور مریض ہر انسان کی بہترین ہمدردی کے مستحق ہوتے ہیں کیونکہ سب پر کبھی نہ کبھی یہ وقت پڑا ہی کرتا ہے اور مجھ کو یقین ہے کہ میں آدم بیزار بھی نہیں ہوں۔ میں تو

بھاری سے بھاری تھان اور وبائی سے وبائی بیماری سے بھی پریشان نہیں ہوتا لیکن نہیں برداشت کر سکتا تو ان لوگوں کو جو رات میں سوتے وقت کھانستے ہیں اور خرائے لیتے ہیں بالخصوص ایسی کھانسی جسے ہم ”حقہ کھانسی“ کہہ سکتے ہیں اور ایسے خرائے جو بکرے کی گردن پر چھری رکھنے کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔

میری برگشتہ قسمتی میرے دوستوں کی شکل میں جو بس گھنٹہ میرے ساتھ رہتی ہے جس کے لئے مکان اور زمان کی قید نہیں۔ اگر میں ان سے نگاہ بچا کر کسی گننام گوشہ میں ٹھلتا ہوا یا کسی دور افتادہ ٹیلہ کی آڑ میں بیٹھا ہوا، تنہائی کے لطف اٹھا رہا ہوتا ہوں تو یکایک میری پشت سے ایک یا چند قہقہوں کی آوازیں آتی ہیں اور میں اس وقت اس طرح کانپ جاتا ہوں جیسے وہ لڑکا جو اسکول سے بھاگا ہوا ہو اور اس کو پکڑنے کے لئے اس کے ہاسٹر ملک الموت بن کر اس کے سر پر نازل ہو گئے ہوں۔ میرا پتہ ان کو اس آسانی سے مل جاتا ہے کہ مشروع شروع میں میں خود ان کی تلاش پر متعجب ہوتا تھا۔ لیکن اس کا بھی ایک سبب ہے — میں پردیس میں ہوں اور یہ قاعدہ ہے کہ ایک نئے شہر میں چند دن قیام کرنے کے بعد انسان ایک نئے تماشا کے اشتہار کی طرح خود بخود مشہور ہو جاتا ہے۔ بشرطیکہ اس کی حرکات و سکنات سے اجنبیت ظاہر ہوتی ہو۔ چنانچہ میں جو کہ پردیس تو کیا خود اپنے دیس میں

بھی ازسرتاپا اجنبی معلوم ہوتا ہوں لوگوں کی نگاہوں میں جلد کھٹک جاتا ہوں اور ایک خطرناک سیاسی مجرم کی طرح آئندہ روز کے زیر مطالعہ رہتا ہوں اور میرے دوست جو مجھ سے بے انتہا محبت کرتے ہیں — ”وہ جارہے ہیں!“ کی مدد سے مجھ تک پہنچ جاتے ہیں جب وہ مجھ کو پالیتے ہیں تو معصوم بچوں کی طرح کلکاریاں مار کر مجھ سے لپٹ جاتے ہیں اور اس وقت میں خود شرمندہ ہو جاتا ہوں اور اپنی سردہری پر افسوس کرنے لگتا ہوں۔ لیکن یہ کیفیت وقتی ہوتی ہے دائمی نہیں۔ میں کبھی کبھی دفتر سے مقررہ اوقات سے قبل واپس آ جاتا ہوں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی نہ کوئی صاحب میری تاک ہی میں بہتے ہیں اور مجھ کو فوراً آن دباتے ہیں۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کی دخل اندازی مجھے ناگوار گزری ہے۔ اس لئے وہ اندر آنے سے قبل ایسی برجستہ تمہید اٹھاتے ہیں کہ میں مسکرا دیتا ہوں اور خود بخود یقین کرنے لگتا ہوں کہ مجھے ان کی سخت ضرورت ہے۔ مثلاً

”اوہو! آج کیسے چلے آئے۔“ وہ جھجکتے ہوئے سوال کرتے ہیں۔

میں خاموش رہتا ہوں۔

”دفتر اتنی جلد بند ہو گیا؟“

میں نفی میں گردن ہلا دیتا ہوں۔

”مزاج تو ٹھیک ہے؟“

میں سر کا اشارہ کرتا ہوں۔

”کچھ بات تو ضرور ہے۔ یہ اضمحلال بلا سبب نہیں ہو سکتا۔“ وہ مسکراتے کی کوشش کرتے ہیں۔

”نہیں صاحب!“ میں تنگ آ کر لب کشائی کرتا ہوں۔

”ایک بات کہوں آپ سے۔“ بڑے راز دارانہ لہجے میں میرے قریب آ کر کہتے ہیں۔

”فرمائیے۔“ میں مجبوری کہتا ہوں۔

”آپ شادی کیوں نہیں کر ڈالتے؟“ وہ بزرگانہ شفقت سے فرماتے ہیں۔

”اوہ نہ — میں سمجھا تھا کہ آپ کوئی نئی بات کہیں گے۔“ میں

ان کے اس بے محل سوال پر قہقہہ لگا کر کہتا ہوں۔

”آپ اس کو مذاق سمجھتے ہیں۔ لیکن آپ کے اضمحلال کا یہی علاج ہوگا“

وہ کہنے مشق ڈاکٹر کی طرح کہتے ہیں۔

”تو میں کہاں مضمحل رہتا ہوں۔ آپ خود ہی دیکھتے ہیں روز۔“ میں

عاجز آ کر کہتا ہوں۔

”ار بھئی میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ آج آپ کی بڑی اچھی بات

آئی ہے۔“ وہ مسکرا کر کہتے ہیں۔

”کیسی نسبت؟“ میں مجسم سوال ہو کر پوچھتا ہوں۔

اور اس کے بعد وہ لڑکی کی خصوصیات پر ایک مورخ کی طرح تبصرہ کرنا شروع کرتے ہیں اور رفتہ رفتہ وہ اس کی ایسی تصویر کھینچتے ہیں کہ جو میرے تخیلات کی ہم پلہ ہوتی ہے۔ اسی دوران میں مجھے خیال آتا ہے کہ وہ بہت دیر سے کھڑے ہی ہوئے تھے۔ مجھے اپنی اس بددماغی پر ندامت ہوتی ہے۔ میں ان سے معافی مانگتا ہوں۔ آرام کرسی پر ان کو بٹھاتا ہوں نوکر کو چاء لانے کا حکم دیتا ہوں اور جیب سے سگریٹ نکال کر پیش کرتا ہوں یہاں تک کہ تھوڑی دیر کے بعد ان کا وجود میرے لئے اٹل ہو جاتا ہے۔ اور اگر اس وقت وہ خود بھی جانا چاہیں تو بھی میں کہاں جانے دیتا ہوں۔

(الحکیم سالانہ نمبر ۱۹۳۷ء)

سید ابوطاہر صاحب نے عالمگیر الیکٹریک پریس لاہور میں باہتمام
حافظ محمد عالم صاحب پرنٹر چھپوا کر لوہے سے شائع کیا۔

